طلوعِ اسلام

NEXT ISSUE

in

MEMORY OF

POET "IQBAL"

یومِ اقبال

اپریل آرہا ہے اور مختلف گوشوں میں ولولۂ شوق پھر یومِ اقبال منانے کیلئے نوید بہار بن رہا ہے۔ ہم اس باب میں تمام ان حضرات سے جو یومِ اقبال منانے کا ارادہ رکھتے ہیں، دو ایک گذارشات نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک طریقِ کار کے متعلق اور دوسری روحِ یادگار کے متعلق۔

جہاں تک طریقِ کار کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ یومِ اقبال کی بجائے یادگارِ اقبال کا ایک ہفتہ منایا جایا کرے جس کے مختلف دنوں میں مختلف مقامات پر اجتماعات کئے جائیں۔ اس سے ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ صاحبانِ شوق ایک سے زیادہ اجتماعات میں شرکت کا موقع مل سکے گا۔ اور دوسرے یہ کہ ان اجتماعات کی روئداد تفصیل کے ساتھ اخبارات میں شائع ہو سکیں گی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس یادگار کا پورا انتظام الاوقات کسی مرکزی ادارہ کی ہدایت کے تابع مرتب ہوا کرے۔ ہمارے نزدیک اس مرکزیت کی مستحق وہی جماعت ہے جس کے سر اولیت کا سہرا ہے، یعنی نوجوانانِ مسجد شاہ چراغ کی مجلس یومِ اقبال کہ جس نے ۱۹۳۸ء میں اس یادگار کی خشت بنیاد رکھی لیکن اگر کسی وجہ سے یہ بزم اس مرکزیت کو اپنے ہاتھ میں لانا نہ چاہے تو اس کے بعد ہمارے خیال میں یہ کام کراچی کی اقبال سوسائٹی کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے جو حال ہی میں وجود میں آئی ہے اور جس کے ساتھ منتظر نگاہوں کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

جہاں تک روحِ یادگار کا تعلق ہے ہمارے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ اقبال نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا۔ اس وقت ملک کی فضا میں دستورِ پاکستان کی تدوین کا مسئلہ ایٹم کی موجوں کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آئندہ یومِ اقبال پر ہر مقام پر یہ تجاویز سامنے لانی چاہئیں کہ جیسا کہ پاکستان کے تصور دینے والے اقبال نے بتایا تھا مملکتِ پاکستان کے دستور کی بنیاد خالص قرآن پر ہونی چاہئے۔ ان تمام تجاویز کو حکومت تک اور اس مرکزی ادارہ تک پہنچا دیا جائے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ نیز منتخب مقالات کو بھی اسی مرکزی ادارہ کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ ان کی اشاعت کا مناسب انتظام کر سکے۔

پاکستان کے مسلمانوں کو ابھی اس حقیقت کا پورا پورا احساس نہیں کہ اقبال کا وجود مبدءِ فیض کی کتنی بڑی خسروانہ کرم گستری تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جس قسم کی خالص قرآنی فکر آج پاکستان کے اکثر گوشوں میں جلوہ پاش نظر آتی ہے باقی ممالک اسلامی اس سے بالکل تہی دامن ہیں۔ اس فکر کی نور افشانیاں صرف اقبال کی بصیرتِ قرآنی کی رہینِ منت ہیں۔ اگر ہم میں اقبال نہ ہوتا تو ہم انسانی فکر کے ان منور گوشوں سے اس طرح محروم رہ جاتے جس طرح اقبال کی فکر اپنی تمام تجلیات سے محروم رہ جاتی اگر وہ قرآن کی شمع عالمتاب سے مستنیر نہ ہوتے۔

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدلِ اشتراک	مرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	محمد یونس	آٹھ آنے (پاکستانی)
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

جلد ۴	مارچ سنہ ۱۹۵۱ء	نمبر ۳

فہرستِ مضامین

یومِ اقبال	۱
لمعات	۳-۱۰
دستورِ پاکستان	۱۱-۲۱
باب المراسلات (افغانستان کا نظامِ اسلامی)	۲۲-۲۳
انفرادی ملکیت اور قرآن (حکیم ابوالنظر صاحب)	۲۵-۶۷
مسلمان کا نصب العین (سید جعفر شاہ صاحب)	۶۸-۷۷
رمزِ درود (نظم) (اسد ملتانی صاحب)	۷۸-۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

فروری کے شروع میں ٹھیک دو سال کے بعد کراچی میں موتمر عالمِ اسلامی کا دوسرا اجلاس ہوا۔ جو اجتماع دو سال پہلے منعقد ہوا تھا اس میں بھی مسلمانوں کے بہت سے ممالک کے نمائندے شامل ہوئے تھے، لیکن اس مرتبہ تعداد اور تنوع ہر دو اعتبارات سے اس اجتماع میں ترقی نظر آتی تھی۔ کارکنانِ موتمر کی ہمت واقعی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے ان اطراف واکناف سے مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جن کے ناموں تک سے اکثر کان ناآشنا تھے۔ صرف اکٹھا کرنا ہی نہیں بلکہ ان کے سفر اور رہائش کے انتظامات اور اخراجات، پھر اس کانفرنس کا انعقاد اور اس کے متعلقات وتضمنات مل ملا کر اتنا بڑا ہنگامہ بن جاتے ہیں کہ اس کیلئے اچھے خاصے دردِ سری نہیں بلکہ دردِ جگر کی بھی ضرورت ہے۔

موتمر کے اربابِ بست وکشاد تمام اسلامی ممالک سے اس قدر جمِ غفیر کو ایک مقام پر اکٹھا کر دیتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اجتماع سے بالآخر مقصود کیا ہے۔ ذرا اجتماع کی اہمیت پر غور کیجئے۔ دنیا کے چالیس کروڑ مسلمانوں کے نمائندوں کا اجتماعِ عظیم! اس کے تصور سے انقلاب بردوش تمنائیں ابھرتی نظر آنے لگ جاتی ہیں۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ اس اجتماعِ عظیم سے نتیجہ کیا مرتب ہوتا ہے تو متجسس نگاہیں خاسر و ناکام کاشانۂ چشم میں واپس آجاتی ہیں۔ جن حضرات کو موتمر کے جلسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے انھوں نے دیکھا ہوگا کہ کم وبیش تمام تقریروں کا انداز کچھ اس قسم کا تھا۔ سب سے پہلے یہ مرثیہ خوانی کہ مسلمان دنیا میں ذلیل وخوار ہیں۔ مفلسی اور بیچارگی، نکبت وادبار، بے کسی اور بے بسی، مظلومی اور زیردستی کی لعنتیں ان پر مسلط ہیں۔ دولِ یورپ کا پنجۂ استبداد ان کا گلا گھونٹ رہا ہے جس کے نیچے نہ انھیں تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے۔ فلسطین سے مٹھی بھر یہودی تمام عرب کیلئے وجہِ ہراس بنے ہوئے ہیں۔ مراکو، ٹیونس، الجزائر اور دیگر اسلامی ممالک کے باشندے بہیمیت اور بربریت کا شکار ہو رہے ہیں۔ مصر برطانوی فوجوں کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہو رہا ہے۔ جوناگڑھ، حیدرآباد، کشمیر ہندوؤں نے ہتھیا لئے ہیں۔ انگریز ہمارے ساتھ دھوکہ وفریب کر رہا ہے۔ یو۔ این۔ او باوجود ہماری وفاشعاریوں کے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرتی۔ ہم تباہ ہوگئے، ہم برباد ہوگئے، ہم لٹ گئے۔ ایک دن تھا کہ ساری دنیا ہمارے دبدبے اور طنطنے سے کانپتی تھی۔ ہماری رفعتوں کے آگے آسمان سرنگوں تھا۔ قیصر وکسریٰ ہمارے باج گزار تھے۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہمارا سکہ رواں تھا۔ آج ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ خود ہماری قسمتوں کے فیصلے دوسری قومیں کرتی ہیں۔ جس کا جی چاہے ہمیں رہن رکھ لیتا ہے جس کا جی چاہے فروخت کر لیتا ہے۔ کوئی مصیبت نہیں جو ہم پر نہ آ چکی ہو۔ کوئی آفت نہیں جو ہم پر نہ ٹوٹ چکی ہو۔ وقس علیٰ ہذا۔

اس مرثیے کے بعد تشخیص مرض اس طرح ہوتی ہے کہ یہ سب اسلئے ہے کہ ہم نے خدا اور رسول کو چھوڑ دیا۔ ہم نے اسلامی شعار کو ترک کر دیا۔ ہم میں اسلاف کی خوبیاں نہ رہیں۔ ہم میں اتحاد نہیں، اخوت نہیں، یگانگت نہیں، یکجہتی نہیں، یک رنگی نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہماری صفوں میں انتشار ہے۔ ہمارے عزائم میں ضعف ہے۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ ہم میں ایمان کی کمی ہے، عمل کی کوتاہی ہے۔

اس کے بعد نسخہ تجویز ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا، اگر ہم اب بھی اللہ سے اپنا عہد استوار کر لیں، اگر ہمارے عقائد صحیح ہو جائیں اور پورے اعمال میں پختگی آجائے۔ ہم سب کو بھائی بھائی بن جانا چاہئے۔ ہمارے دلوں کو اخوت کے رابطے سے ایک ہو جانا چاہئے۔ انڈونیشیا سے لیکر مراکو تک ہم ایک سیل رواں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ہم سب ایک ہو جائیں تو دنیا کی کوئی قوت ہماری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔ بس کمی باہمی اتحاد کی ہے۔ اس کے بعد واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً اور انما المومنون اخوۃ وغیرہ آیات پر تقریر کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ عربی زبان کی خطابت، قرن اولیٰ کی تاریخ کے درخشندہ واقعات، سامعین جذبات کے پیکر، اُدھر مقرر کی آتش فشانی، ادھر سامعین کے فلک بوس نعرے، جلسے میں ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

یہ تھے کم و بیش اندازان تقاریر کے جو عالم اسلامی کے ان نمائندگان کے اجتماعِ عظیم میں تین چار روز تک ہوتی رہیں۔ اس کے بعد چند ایک ریزولیوشن پاس ہوئے اور سب آنے والے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ یعنیہی کچھ دو سال پہلے ہوا تھا۔ اسوقت بھی یہی تقریریں تھیں۔ اسی قسم کے ریزولیوشن پاس ہوئے تھے۔ یہی ہنگامہ خیزیاں تھیں، یہی غوغا آرائیاں تھیں۔ کسی نے کوئی ذکر تک نہ کیا کہ اس دو سال میں ہم نے کیا کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ لوگ عمر بھر میں پہلی دفعا کٹھے ہوئے ہیں اور پہلی بار انھوں نے تہیہ کیا ہے کہ ہم باہمی اتحاد سے ساری دنیا کو ہلا دیں گے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان تقریروں میں کوئی بات ایسی بھی ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو بھی معلوم نہیں۔ آپ کسی گدھا چلانے والے سے بھی پوچھئے وہ بھی اپنی پوری قسمت کا رونا روئیگا۔ وہ یہ بھی بتائے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں باہمی ہمدردی نہیں رہی اور وہ علاج بھی یہی تجویز کریگا کہ مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی رہنا چاہئے۔ اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا یہی وہ باتیں ہیں جنھیں سامنے لانے اور دہرانے کیلئے تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندوں کا ایک جگہ جمع ہونا ضروری ہے؟ اور اس کے بعد سوچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا ان باتوں کے بار بار دہرانے سے ان مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا جن کا اس طرح رونا رویا جا رہا ہے؟ مسلمان آج سے ان مصیبتوں میں گرفتار نہیں۔ اس پر اسی حالت میں صدیاں گزر چکی ہیں۔ باہمی اتحاد اور مواخات کے احکام قرآن میں موجود ہیں، احادیث میں ان کا بار بار ذکر ہے۔ اسلاف کی تاریخ میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں ان کی تاکید موجود نہ ہو۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس پر اس کا اعتراض نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں، اخوت نہیں، یگانگت نہیں۔ کیا کبھی کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ ایسا کیوں نہیں اور ایسا کس طرح ہو سکتا ہے، تمام عالم اسلامی کے ان نمائندوں میں سے کسی ایک نے بھی نہ بتایا کہ ہم میں اتحاد کیوں نہیں اور اتحاد کیسے پیدا ہو سکتا ہے محض یہ کہہ دینا کہ ہم نے خدا اور رسولؐ کے راستے کو چھوڑ رکھا ہے مرض کی تشخیص نہیں۔ تشخیص کا تقاضا یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ ہم نے ان احکام کو کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ اور اس کے بعد یہ

ان احکام پر کاربندی کس طرح سے ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان خالی تصورات کی فضاؤں میں اڑنے کا عادی رہے گا وہ نہ اپنے امراض کی تشخیص کر سکے گا نہ ان کا کوئی حل سوچ سکے گا۔ یہ قوم یکسر جذباتی ہو چکی ہے اور صدیوں سے اپنے آپ سے شاعری کرنے کی وجہ سے افسانوں کی دنیا میں رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ یہ حقائق سے آنکھیں چراتے ہیں، ان کا سامنا کرنے سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ اور اسی گریز اور فرار کا جذبہ ہے جو انھیں الفاظ کی خود ساختہ افسانوی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خدا نے آدم کو زمین میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ جو انسان زمین کے معاملات کو نہیں سلجھاتا، اس کیلئے آسمان کی باتیں کرنا برگِ حشیش سے کم نہیں ہوتا۔ زمین کے مسئلے مجرد گفتگو . . . .

(Abstract Talk) نہیں چاہتے۔ وہ مٹی اور پتھر کی طرح ٹھوس (Concrete) باتوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ گریز اور فرار کی راہبانہ ذہنیت نے ہمارے اندر غیر شعوری طور پر یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ہم زمین کی باتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور آسمان کی تصوراتی دنیا کو خطیرہ قدس سمجھتے ہیں۔ یورپ کی ملحد، بے دین قومیں ہماری نگاہوں میں ذلیل و خوار ہیں۔ انھیں خدا اور رسول سے کچھ واسطہ نہیں۔ ہم خدا اور رسول کے ماننے والے اسلئے ہم ان سے بہت اونچے ہیں۔ ہم میں کمی صرف اتنی ہے کہ ہمارے عقائد صحیح نہیں، قوت عمل نہیں، اتحاد نہیں، یگانگت نہیں، عزم نہیں، استقلال نہیں، قوت نہیں، ضبط نہیں، غرضیکہ کوئی ایسی چیز نہیں جو زندگی اور حرارت کی آئینہ دار ہو۔ لیکن بایں ہمہ ہم جی ہی جی میں اپنے آپ کو یورپ کے ملحدوں اور بے دینوں سے بہت اونچا سمجھتے ہیں محض اسلئے کہ ہم خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہم زمین کی باتوں کو زمین میں رہنے والوں کی طرح کبھی نہیں سوچتے اور یہ اس لئے کہ اس طرح سوچنے میں دماغ کو بھی محنت کرنا پڑتی ہے اور اس کے بعد اس فکر کی صحت اور سقم کو عملی نتائج سے پرکھا جاتا ہے۔ اگر دو سال پہلے ہی اجتماع اس نہج سے سوچتا اور اس کے بعد کچھ تدابیر اختیار کرنے کا تہیہ کرتا تو اب دو سال کے بعد سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا کہ آؤ دیکھیں کہ اس دو سال میں ہم کہاں تک اپنا مقصود حاصل کر سکے ہیں، لیکن جب گفتگو محض لفظوں تک محدود رہے تو جس قسم کی غزلیں دو سال پہلے لکھی گئی تھیں، اسی قسم کی اب لکھی جا سکتی ہیں۔ یہ کہنا کہ ہم شامی اور پاکستانی کشمیر کے میدانوں میں خنجر بکف ملیں گے، ایک نہایت حسین مصرع ہے جو اس وقت تک کیف بار رہ سکتا ہے جب تک یہ نہ پوچھا جائے کہ فلسطین کے میدانوں میں یہودیوں کے مقابلے میں تمہاری تلواریں کیوں کند ہو کر رہ گئیں اور جو تلواریں وہاں نہ اٹھ سکیں، وہ ہزاروں میل کشمیر کی وادیوں کو کس طرح سے لالہ زار بنا سکیں گی۔ یہ کہنا کہ انڈونیشیا سے مراکو تک ایک مسلم بلاک بنا دیا جائیگا جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تمام دنیا کی قوتوں کے سیلاب کو روکے گا، ایک اور زمزمہ بار مصرع ہے لیکن اس کی نغمہ سنجی بھی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک یہ نہ پوچھا جائے کہ میثاق سعد آباد والے بلاک کو کس کی نظریں کھا گئیں جو ایک بڑے بلاک کی فکر ہو رہی ہے۔ یہ کہنا کہ ہم پاکستانی پناہ گزینوں کے مصائب کے حل کیلئے اپنے جبے اور دستاریں تک بیچ دیں گے، فی الواقعہ ایک مرصع شعر ہے لیکن اس کی تابناکی اسوقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک یہ نہ پوچھا جائے کہ یہ جبے اور عمامے فلسطین کے مہاجرین کی عریانی کو کیوں نہیں ڈھانپ سکے؟ مسلمان اس قسم کی خواب آور داستان گوئی کا ایسا عادی ہو چکا ہے کہ واقعات کی دنیا (Matter of Fact World) کی باتیں اسے پھیکی پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ اسے اس قسم کی باتیں سننے میں لذت ہی نہیں ملتی۔ اور جونہی اسے اس قسم کے "شعر" سنائے جائیں

توان سے اس کی روح رقص میں آجاتی ہے۔

پاکستان کی نوزائیدہ مملکت جن خطرات سے دوچار ہے وہ کسی نگہ حقیقت بیں سے پوشیدہ نہیں یہ خطرات "زمین" سے متعلق ہیں اور ان کا مقابلہ زمینی انداز فکر سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں "شاعری" کی پہلے ہی کچھ کمی نہیں تھی کہ اب تمام اسلامی ممالک کے داستان گو یہاں جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اگر حوادث زمانہ کے کسی ایک تھپیڑے نے انھیں ذرا سا جگا بھی دیا تو ان ناصحین مشفقین کی خواب آور کہانیاں انھیں پھر افیون پلا کر سلا دینگی۔ اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ کر واپس چلے جائیں گے اور ان کی شعلہ نوائیوں کا خمیازہ پاکستان کو بھگتنا پڑیگا۔ اور اگر یہ سلسلہ کچھ عرصے تک اسی طرح جاری رہا تو یقین مانئے کہ پاکستان بھی انہی جیسا ہو کر رہ جائیگا۔ یہ لوگ جو یہاں آکر عالمگیر اتحاد کا سبق دیتے ہیں ان کو کہنا یہ چاہیے کہ آپ پہلے اپنے گھروں کے ایک چھوٹے سے خطہ میں اتحاد پیدا کیجئے، اس کے بعد اس اتحاد کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیجئے۔ اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو ہمیں ان پند و نصائح سے معاف رکھئے جس قرآن اور حدیث سے آپ یہ کچھ ہمیں بتلانے آتے ہیں، وہ خود ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ با کنی نظیری بخدا کہ لازم آید ز تو احتراز کردن!

ہم جانتے ہیں کہ ہماری جذبات پرست قوم پر ہماری یہ تلخ نوائی بڑی گراں گزریگی۔ لیکن ہمارے نزدیک اب وقت وہ نہیں رہا کہ محض جذبات کی رعایت سے قوم کو فریب میں رکھا جائے۔ مسلمانوں کی اخوت، امت کی وحدت، ان کی اجتماعیت، ان کی مرکزیت سے کس کلمہ گو کو انکار ہو سکتا ہے۔ اور طلوع اسلام کا تو ایک ایک ورق اسی وحدت اور ائتلاف کا نقیب ہے۔ لیکن یہ وحدت محض تقریروں اور قراردادوں سے وجود میں نہیں آسکتی۔ وحدت فکر و عمل کے لئے وحدت مقصد نہایت ضروری ہے۔ آپ دو افراد میں اتحاد نہیں پیدا کر سکتے جب تک ان کا مقصود ایک نہ ہو۔ اور جب دو افراد میں وحدت مقصد کے بغیر اتحاد ناممکن ہے تو چالیس کروڑ انسانوں میں وحدت مقصد کے بغیر اتحاد کا امکان کیسے ہو سکتا ہے۔ مقصد کی وحدت سے پہلے خود مقصد کا تعین ضروری ہے۔ یعنی اس امر کا تعین کہ ہم چالیس کروڑ انسانوں کے سامنے منزل کونسی ہے۔ یہ منزل محسوس اور مشہود طور پر متعین کرنی ہوگی۔ محض الفاظ اور اصطلاحات سے منزل کا تعین نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا مقصود اور نصب العین اسلام کا احیا ہے۔ اس میں کس مسلمان کو کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ آج کوئی دو مسلمان بھی ایسے نہیں ملیں گے جن کے ذہن میں اسلام کا مفہوم ایک ہو۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کوئی نومسلم یہ کہے کہ مجھے کوئی ایسی کتاب دیجئے جس سے معلوم ہو سکے کہ اسلام کیا ہے تو سارے عالم اسلامی کی کسی زبان میں کوئی کتاب ایسی نہیں جسے ہم یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ اس سے اسلام کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائیگا۔[1] کتاب کو تو چھوڑیئے، کوئی شخص زبانی بھی کسی کو یہ نہیں سمجھا سکتا کہ اسلام سے مفہوم کیا ہے۔ جب نفس اسلام کے متعلق ہماری تعبیرات اور

[1] ہم انسانی تصانیف کا ذکر کر رہے ہیں، کتاب اللہ کا نہیں۔

تفہیمات کا یہ عالم ہے تو فرمائیے کہ احیائے اسلام کی اصطلاح سے کوئی کیا سمجھ سکے گا۔ اور جب یہ اصطلاح ہی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتی تو اسے اپنا نصب العین قرار دینا کیا نتیجہ برآمد کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قراردادیں دیکھئے تو وہ کہکشاں گیر نظر آئیں گی اور جب ان قراردادوں کے نتائج پر نگاہ ڈالئے تو وہ یکسر معدوم ہوں گے۔ اس لئے کہ ہم نے اپنے الفاظ کے مفہوم کو متعین کبھی نہیں کیا۔ الفاظ کا مفہوم محسوس و مشہود ہونا چاہئے۔ صدرِ اول میں ایک صحابی سے کسی غیر مسلم نے پوچھا کہ ہر قوم کی کوئی نہ کوئی "حقیقت" ہوتی ہے۔ تمہاری "حقیقت" کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت اور اس کے قلعے ہماری حقیقت کی ابھری ہوئی نشانیاں ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم اس بنیادی مسئلہ کو طے کریں کہ اسلام سے مفہوم کیا ہے۔ جب یہ مفہوم مشہود شکل میں متعین ہو جائے تو پھر اس محسوس مفہوم کو اپنا نصب العین قرار دیا جائے۔ اس وحدت نصب العین کے بعد اتحاد کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکیں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ چونکہ آج کل مملکت پاکستان کے دستور کا مسئلہ فضائے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے، اس لئے عالمِ اسلامی کے نمائندگان کا یہ اجتماع شاید یہ بتائے کہ ایک اسلامی مملکت کا دستور کیا ہونا چاہئے۔ لیکن ہماری یہ آرزو خوش فہمی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان جمع ہونے والوں میں کسی ایک نے ایک لفظ بھی اس بارے میں نہیں کہا، اور اصل یہ ہے کہ وہ کہہ بھی کس طرح سکتے تھے۔ وہ جن ممالک سے آئے تھے وہاں کونسا اسلامی دستور نافذ تھا جو وہ اہلِ پاکستان کو اس کا سراغ دے سکتے؟ ایک تو ان کے دماغ ہی فکر سے تہی تھے، دوسرے غالباً یہ خوف کہ اگر اسلامی دستور کی کوئی بات ان کی زبان سے نکل گئی تو اپنے گھر والوں کو جا کر کیا جواب دیں گے۔ جن لوگوں میں ابھی تک بادشاہتیں قائم ہوں، اور وہ برسرِ منبر خدا اور رسول کی حمد و ثنا کے بعد بادشاہ کی شان میں بھی قصیدہ خوانی ضروری سمجھیں، ان سے اسلامی دستور کے متعلق باتیں سننے کی توقع امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر آج مسلمانانِ عالم کا کوئی اجتماع اسلامی مملکت کا دستور مدون کر سکے تو یہی دستور تمام عالمِ اسلامی کی وحدت کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ دستور اسلام کی آئیڈیالوجی کا عملی پیکر ہوگا اور یہی وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ دستور قرآنی آئیڈیالوجی کے مطابق بنایا جائے۔

مؤتمر نے اپنے آخری اجتماعات میں یہ بھی کہا کہ تمام اسلامی ممالک کی حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ دار ہوں۔ غنیمت ہے کہ انھیں اس بات کا بھی خیال آگیا کہ انسانی زندگی کی کچھ بنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں، اور ان ضرورتوں کا پورا کرنا مملکت کے فرائض میں داخل ہے۔ لیکن یہ خیال بھی درحقیقت زمانے کی موجودہ رو کا پیدا کردہ ہے۔ آج فضائے عالم اس سوال سے اس قدر معمور ہو چکی ہے کہ اس سے غیر متاثر رہنا ناممکن ہے۔ اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلامک سوشلزم کی سی اصطلاحات رائج ہو رہی ہیں۔ لیکن جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے اب دنیا قراردادوں اور اصطلاحوں کے بل بوتے پر بہلائی نہیں جا سکتی۔ معاش کا مسئلہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ بن چکا ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے کہ جو ٹھوس حل چاہتا ہے۔ کسی بھوکے کا پیٹ محض شاعری سے نہیں بھرا جا سکتا۔ لہٰذا مؤتمر کا یہ کہہ دینا کہ ہر اسلامی مملکت کو چاہئے کہ وہ افرادِ مملکت

کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہو، کچھ معنی نہیں رکھتا۔ پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم کیوں ہے، اور جب اس سبب کا سراغ مل جائے تو پھر اس کا حل مشکل نہیں رہتا۔ جس چیز نے انسان کو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رکھا ہے وہ غلط معاشی نظام ہے جو آج بری طرح سے انسانوں پر مسلط ہے۔ یہ نظام اپنی بدترین شکل میں مسلمانوں کے ممالک میں لعنت بار ہے۔ اس نظام کو علیٰ حالہٖ رکھنا اور قرارداد یہ پاس کرنا کہ وہاں کے انسانوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا کفیل یہ نظام ہو، اپنی ہنسی اڑانا نہیں تو اور کیا ہے۔ آج جن لوگوں کے دلوں میں انسانیت کا صحیح درد ہے ان کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ اس غلط معاشی نظام کو بدلنا ہے جو جسدِ انسانیت میں دق کے جراثیم کی طرح سرایت کر چکا ہے۔ اسلام دنیا میں اسی غلط نظام کو الٹنے کے لئے آیا تھا۔ اور جب تک اسلام کو اپنا مشن پورا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اس وقت تک اس قسم کی قراردادیں اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے سے زیادہ کچھ قیمت نہیں رکھیں گی۔ انقلابی قوتیں دنیا میں سیلاب کی طرح امڈ رہی ہیں۔ یہ سیلاب خالی قراردادوں سے نہیں روکا جا سکتا۔

میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام

پاکستان میں تو کچھ توقع کی جاسکتی ہے کہ اسلام کو اس کی برومندی کا موقع دیا جائے لیکن ہمیں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ اسلئے کہ غیر اسلامی نظام کے دو ہی ستون ہیں۔ ایک ملوکیت اور دوسرے مولویت۔ پاکستان میں ان میں سے صرف ایک ستون موجود ہے یعنی مولویت کا، لیکن دوسرے اسلامی ممالک میں ملوکیت اور پیشوائیت کے دونوں ستون زمین گیر ہیں۔ ان ستونوں کو گرا کر ان کی جگہ انسانیت ساز اسلامی نظام کا قیام بہت بڑی ضربِ کلیمی کا محتاج ہے اور اس کیلئے تمام عالمِ اسلامی میں کوئی صاحبِ ضربِ کلیم دکھائی نہیں دیتا۔ پاکستان میں ملوکیت کی لعنت نہیں۔ اس لئے یہاں مقابلہ صرف پیشوائیت کا ہے۔ لیکن پاکستان ہو یا دیگر اسلامی ممالک، زندہ وہی رہ سکے گا جو صحیح قرآنی نظام ربوبیت کو اختیار کرلے گا۔ جس نے اس میں تامل کیا وہ آنے والے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا، اور

پھر اس کی داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس نظام ربوبیت کی ترویج میں بھی توقف کی اجازت نہیں۔ انقلاب کی موجیں اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں کہ اگر کوئی شخص جوتا اتارنے کیلئے بھی رک گیا تو اس کے سنبھلنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے اب تو جسے زندہ رہنا ہے اسے بلا مزید توقف اپنے لئے زندگی کا سامان پیدا کر لینا چاہیئے اور زندگی کا یہ سامان قرآنی نظام ربوبیت کے باہر اور کہیں نہیں۔ جس کا جی چاہے اس سے آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو آنے والے سیلاب کی نذر کردے اور جس کا جی چاہے اسے اختیار کرکے اپنے آپ کو زندگی کی خوشگواریوں کا مالک بنالے۔

انا ھدینہ السبیل اما شاکرا واما کفورا۔

جنوری کے طلوع اسلام میں حکومت کی اس تجویز کے متعلق مختصراً لکھا گیا تھا جس کی رو سے ایک کمیٹی تشکیل کی جانے والی تھی تاکہ وہ ملک میں مروجہ قوانین کو شریعت کے مطابق از سر نو مرون کرے۔ خبر تھی کہ یہ کمیٹی سید سلیمان ندوی صاحب کی زیر صدارت کام کریگی۔ اب اس خبر کی تصدیق ہوگئی ہے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ یہ کمیٹی جلد اپنا کام شروع کریگی۔ ہم نے ضمناً بتایا تھا کہ اس موقع پر اس قسم کی کمیٹی کے تعین کا سوال کس قدر قبل از وقت اور ضیاع مال اور پریشانی فکر و نظر کا موجب ہوگا۔ ذرا غور کیجئے اس وقت تک ہنوز یہ بھی طے نہیں پایا کہ دستور پاکستان کے بنیادی خط و خال کیا ہوں گے۔ حکومت نے اس مقصد کیلئے ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء تک تجاویز اور سفارشات طلب کی تھیں۔ اس کے بعد یہ مسئلہ غالباً کسی کمیٹی کے سپرد ہوگا۔ کمیٹی رد و قبول کے بعد اپنی رپورٹ مجلس دستور ساز کے سامنے پیش کرے گی پھر مجلس دستور ساز اس رپورٹ پر غور کریگی اور اس کے بعد کہیں جاکر اس امر کا فیصلہ ہوگا کہ دستور پاکستان کے بنیادی اصول کیا ہوں۔ بنیادی اصول طے پانے کے بعد پھر جزئیات کی تدوین کا مرحلہ سامنے آئیگا۔ اس میں جس قدر وقت صرف ہوگا، ظاہر ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد کہیں ایسا وقت آئیگا کہ یہ دیکھا جائے کہ ملک کے قوانین اس طے شدہ دستور کے مطابق ہیں یا نہیں، اور اگر نہیں ہیں تو ان میں تطابق اور توافق کی کیا صورت ہوگی۔ ملک کے قوانین ہمیشہ دستور مملکت کے تابع ہوتے ہیں جب تک کسی مملکت کا دستور مرتب نہ ہو جائے، ملک کے قوانین کی تدوین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ پاکستان کی تجربہ گاہ ہے کہ جہاں دستور سے پہلے قانون سازی کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ اقبال نے تو یورپ کے متعلق کہا تھا:

میخانۂ مغرب کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

اسے کیا خبر تھی کہ اس کے تصورات کا پاکستان اس باب میں میخانۂ مغرب سے کم نہیں ہوگا۔

اعلان میں یہ کہا گیا ہے کہ کمیٹی کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ملک کے قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کرے۔ ہم بار بار اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرا چکے ہیں کہ سنت کا لفظ بڑا مبہم، غیر واضح اور غیر متعین ہے۔ سنت نبی اکرم صلعم کے اس طریق کو کہا جاتا ہے جس کا ثبوت روایات سے ملتا ہے، اور روایات کی جو حقیقت ہے وہ اب قارئین طلوع اسلام کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آج تک مسلمانوں کے کوئی دو فرقے اس باب میں متفق نہیں ہو سکے کہ رسول اللہ صلعم کی مستند اور صحیح سنت کیا تھی۔ مختلف کتب روایات کا باہمی تضاد حدیث کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔ حتیٰ کہ حدیث کی کسی ایک کتاب میں بھی ایسی ایسی متضاد روایات سامنے آتی ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ ان تضادات کو کس طرح ایک ہی ذات رسالتمآب کی طرف منسوب کر دے۔ تضادات کے ایسے مجموعوں کی رو سے کسی متفق علیہ قانون کا مرتب کرنا ایک عبث کوشش ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک کمیٹی کیا ایسی سینکڑوں کمیٹیاں روایات کی رو سے کوئی ایسا مجموعہ قوانین مرتب نہیں کر سکتیں جسے متفق علیہ کہا جا سکے۔

پھر روایات سے آگے فقہ آتی ہے اور اہل فقہ کے نزدیک ان کے مسلک کی فقہ کا مقام اسی طرح روایات سے اونچا ہوتا ہے

جس طرح روایات پرستوں کے نزدیک روایات کا مقام قرآن سے اونچا ہوتا ہے۔ اہل فقہ اور اہل حدیث (مقلد اور غیر مقلد) کے جھگڑے ایسے واضح ہیں کہ ان کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کے باہمی تعصب کا تو یہ عالم ہے کہ خود امام بخاریؒ، امام ابو حنیفہؒ پر تہمتیں دھرتے ہیں اور انہیں ضعیف الحافظہ شمار کر کے ان کے تفقہ کو ناکارہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہیں تک بس نہیں، چونکہ امام ابو حنیفہؒ کوفی تھے اس لئے کوفے والوں کے متعلق یہ فتویٰ صادر ہو گیا کہ ان کی حدیث بے نور ہے (دیکھئے سنن ابی داؤد)۔ ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ کوفہ عراق میں ہے اس لئے عراق والوں کے متعلق یہ فتویٰ صادر ہو گیا کہ ان کی سو حدیثوں میں ننانوے چھوڑ دو اور جو ایک لو تو اسے بھی مشتبہ سمجھو۔ یہ تو اہل فقہ اور اہل حدیث کے باہمی مجادلہ کا حال ہے۔ خود اہل فقہ کی باہمی نبرد آزمائیاں بھی محتاج وضاحت نہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ملک کیلئے کسی متفق علیہ قانون کی تدوین کا تصور ہی لاطائل ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں سید سلیمان ندوی صاحب چونکہ حنفی المذہب ہیں اسلئے یہ لامحالہ حنفی فقہ کے مطابق ہی قانونی سراغ دیکھیں گے اور فقہ حنفی کا قانون وہ ہے جو آجکل افغانستان میں رائج ہے۔ (اس ضمن میں وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو طلوع اسلام کی اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔)

ہم باوجود سعی بسیار نہیں سمجھ سکے کہ اس قسم کے اقدامات سے بالآخر حکومت کا منشا کیا ہے۔ اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں کہ بحالات موجودہ اس قسم کی کوششیں کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں کریں گی۔ اس کے برعکس ان کوششوں کے نتائج کے نقصانات بالکل بدیہی ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو اس قسم کے اقدامات کا ایک ہی فائدہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ان سے قوم کو مطمئن رکھا جا سکتا ہے کہ ہماری اسلامی مملکت میں شریعت حقہ کے قانون کے نفاذ کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اگر مقصود فی الواقعہ یہی ہے تو اس کے متعلق کچھ بھی کہنا بے کار ہے۔ اور اگر مقصود یہ نہیں اور حکومت فی الواقعہ یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کا نظام حیات خدا کی منشار کے مطابق متعین ہو جائے تو اس کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے قرارداد مقاصد میں اس حقیقت کا اعلان کیا جائے کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد خالص قرآن پر ہوگی اور پھر پاکستان کے بنیادی اصولوں کو قرآنی خطوط کے مطابق متشکل کیا جائے اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں دور حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جزئی قوانین مدون کئے جائیں۔ یہ ضابطۂ قوانین ہر مسلمان کیلئے متفق علیہ ہوگا۔ اسلئے کہ فقہ اور روایات کے ہزار اختلافات کے باوجود کوئی مسلمان قرآن سے انکار کی مجال نہیں کر سکتا۔ اگر پاکستان اس مسلک کو اختیار کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تو مسلمان کا مستقبل کسی صورت میں بھی منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ڈھل سکتا۔

تو اگر خواہی مسلماں زیستن　　　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

وبذٰلک امرت وانا اول المسلمین۔

دستورِ پاکستان

(مولوی صاحبان کا مسودہ)

جیسا کہ طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ضمناً ذکر کیا جا چکا ہے، اواخر جنوری میں پاکستان کے مولوی صاحبان کی ایک کانفرنس بہ صدارت سید سلیمان ندوی صاحب منعقد ہوئی تاکہ دستورِ پاکستان کے بنیادی اصول مرتب کئے جائیں۔ اس کانفرنس میں اکتیس ۳۱ مولوی حضرات نے شرکت فرمائی جن میں اہل فقہ، اہل حدیث، دیوبندی، شیعہ حضرات اور کچھ پیر صاحبان بھی شامل تھے۔ ان کی طرف سے اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کے عنوان سے جو مسودہ شائع ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:

اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے:۔

(۱) اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

(۲) ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

(۳) مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

(۴) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلم اسلامی فرقوں کیلئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

(۶) مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم

کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(۷) باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظِ جان و مال و آبرو، آزادی مذہب و مسلک، آزادی عبادت، آزادی ذات، آزادی اظہارِ رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادی اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

(۸) مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائیگا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعہ صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

(۹) مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انھیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

(۱۰) غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

(۱۱) غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شریعہ کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ ۸ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے

(۱۲) رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

(۱۳) رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

(۱۴) رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

(۱۵) رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً و جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

(۱۶) جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرتِ آرا سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

(۱۷) رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

(۱۸) ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کیلئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کرینگی۔

(۱۹) محکمۂ عدلیہ محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

(۲۰) ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔
(۲۱) ملک کے مختلف ولایات، وانتظاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی، یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔
(۲۲) دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

اس کانفرنس نے تمام اسلامی فکر رکھنے والے اصحاب اور اداروں سے درخواست کی ہے کہ وہ ان متفقہ اصولوں کی روشنی میں دستورِ اسلامی کے متعلق اپنی اپنی تجاویز ۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء تک حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی[۱] کے پاس بھیجدیں۔ اس کے بعد جلدی ہی یہ اجتماع دوبارہ منعقد کیا جائے گا اور تمام تجاویز پر غور کر کے ایک تفصیلی خاکہ مرتب کر دیا جائے گا۔ اس خاکے میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو طلوعِ اسلام کے نزدیک محلِ نظر ہیں۔ مثلاً

شق ۱ "اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے"۔

دستور کا تعلق قوانین (تشریعی) سے ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی تکوینی حاکمیت کا ذکر سمجھ میں نہیں آرہا۔

طلوعِ اسلام میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بیسیوں دفعہ واضح کیا جا چکا ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ اصل حاکم اللہ تعالیٰ ہے تو قانون سازی کے ضمن میں اس کی عملی حیثیت کا واضح کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ عملی حیثیت سے اس کے معنی فقط یہ ہیں کہ ہماری شریعت (قانونِ مملکت) کا سرچشمہ وہ قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے قرآن میں بذریعہ وحی نازل فرمائے۔

شق ۲ میں لکھا ہے کہ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا۔ اسی طرح **شق ۳** میں یہ درج ہے کہ "اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن اور سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے اور منکرات کو مٹائے"۔ اسی طرح **شق ۲۲** میں درج ہے کہ "دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو"۔

ہم اس حقیقت کو بھی متعدد بار واضح کر چکے ہیں کہ مولوی صاحبان کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور دہراتے ہیں تاکہ اس سے عوام کے جذبات کی تسکین کا سامان مہیا کیا جائے اور دوسری طرف ان لوگوں کو مطعون کیا جائے جو دستورِ مملکت کی بنیاد کتاب اللہ پر رکھنے کے آرزومند ہیں۔ لیکن یہ حضرات کبھی اتنا بتانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ سنت سے بالآخر ان کا مفہوم کیا ہے۔ ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی یہ گفتگو مجلسِ وعظ کی گفتگو نہیں، ملک کیلئے دستور مرتب کرنے سے متعلق گفتگو ہے، اور دستور سازی کے

---

[۱] واضح رہے کہ یہ پمفلٹ خود احتشام الحق صاحب کی طرف سے شائع ہوا ہے اور یہ القابات انھوں نے خود اپنی ذات کے متعلق استعمال فرمائے ہیں۔

سلسلہ میں ہر بار واضح اور متعین (Clear and Definite) ہونی چاہئے۔ لفظ کتاب کا مفہوم متعین اور واضح ہے۔ اس سے مفہوم قرآن کریم ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ سنت سے کیا مراد ہے؟ مولوی صاحبان کے نزدیک سنت سے مراد احادیث ہیں اور اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ احادیث کے متعدد مجموعے ہیں اور ہر مجموعے میں (خود مولوی صاحبان کے نزدیک بھی) شاذ و ضعیف ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ لہٰذا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ دستور کی بنیاد احادیث پر ہوگی اور کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جا سکیگا جو احادیث کے خلاف ہو تو اس سے آپ کی مراد احادیث کا کونسا مجموعہ یا اس مجموعے کی کونسی احادیث ہیں۔ آپ کہہ دیں گے کہ اس سے مراد ثقہ احادیث ہیں لیکن پھر یہ سوال سامنے آئیگا کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کونسی حدیث ثقہ ہے اور کونسی ضعیف۔ مولوی صاحبان کے اسی اجتماع میں جس نے اس خاکے کو مرتب کیا ہے وہ اہل حدیث حضرات بھی ہیں جن کے نزدیک (مثلاً) امام بخاری کا مجموعہ احادیث "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" ہے، اور اسی اجتماع میں سید سلیمان ندوی صاحب بھی شامل ہیں جن کے استاذ مولانا شبلی نے اسی مجموعہ بخاری کی کئی حدیثوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ پھر اسی اجتماع میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جن کے نزدیک وہ تمام احادیث ثقہ ہیں جنھیں محدثین سلف نے اپنے اصولوں کے مطابق ثقہ قرار دیا ہے، اور اسی اجتماع میں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بھی ہیں جن کا یہ ارشاد آپ طلوع اسلام کی اشاعت بابت جنوری ۱۹۵۱ء (مضمون مسئلہ معہ) میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ سلف صالحین کی پرکھ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ صحیح حدیث وہ ہے جسے "مزاج شناس رسول اللہ" صحیح قرار دیدے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ اس اجتماع میں مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد اور مفتی حافظ کفایت حسین صاحب مجتہد علمائے اہل تشیع بھی شریک ہیں۔ حدیث کے بارے میں سنیوں اور شیعوں کے اختلاف کا یہ عالم ہے کہ سنیوں کے نزدیک جس حدیث کے راویوں میں کوئی راوی شیعہ ہو یا شبہ کیا جاتا ہو کہ وہ شیعہ ہے، وہ حدیث قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔ اور شیعہ حضرات کے نزدیک تو رسول اللہ کے بعد (اہل بیت کو چھوڑ کر) صرف تین مسلمان باقی رہ گئے تھے، حضرت مقدادؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمانؓ (ملاحظہ ہو فروع کافی۔ باب الروضہ) لہٰذا ان کے نزدیک کسی غیر شیعہ کی روایت سچی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ سنیوں کی احادیث کے مجموعے کے مقابل شیعہ حضرات کے اپنے احادیث کے مجموعے ہیں۔ ان کے ہاں جو حیثیت صحیح بخاری کو ہے، ان کے ہاں اس کی جگہ "اصول کافی" ہے۔ اور ان مجموعوں میں ایک دوسرے کے خلاف حدیثیں ہیں۔

ایک دستور ساز کے سامنے جب یہ اصول پیش کیا جائے گا کہ دستور کی بنیاد سنت پر ہوگی، اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو سنت کے خلاف ہو، اور یہ کہنے والے سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مفتی کفایت حسین صاحب مجتہد ہوں گے تو وہ لازماً پوچھے گا کہ یہ قانون کن احادیث کے مطابق بنایا جائے گا۔ اسلامی مملکت میں معروف و منکر کی بنیاد اصول حلت و حرمت پر ہوگی، یعنی جن چیزوں کو شریعت حرام قرار دے گی، ان سے قانوناً روکا جائے گا اور جنھیں شریعت حلال قرار دیگی، ان کی اجازت

دی جائے گی۔ قرآن نے حرام وحلال کے متعلق یہ فیصلہ فرما دیا کہ جسے کتاب اللہ نے حرام قرار دیا وہ حرام ہے اور اس باب میں اور تو اور خود ذات رسالتمآبؐ کے متعلق بھی فرمایا کہ انھیں بھی خدا کے حلال فرمودہ کو حرام قرار دینے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ (یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک) لیکن احادیث کو دین قرار دینے والوں نے یہ روایت وضع کر لی کہ

> رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے مانند اس کے ساتھ اور بھی۔ (مثلہٗ معہٗ) یاد رکھو کہ عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بڑا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑو اسی قرآن کو تم جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

اس سے قرآن کے باہر حلت اور حرمت کے دروازے کھول دیئے گئے اور حلال اور حرام کا اختیار اللہ کے علاوہ رسول اللہ کو بھی دے دیا گیا۔ شیعہ حضرات اس سے آگے بڑھے اور انھوں نے فرمایا کہ حلت وحرمت کا اختیار صرف رسول اللہ ہی کو نہیں بلکہ شیعہ حضرات کے ائمہ کبارؒ کو بھی ہے۔ چنانچہ "اصول کافی" میں حضرت امام باقرؒ کا ارشاد ہے کہ فھم یحلون ما یشاؤن ویحرمون ما یشاؤن (جس چیز کو وہ چاہیں حلال قرار دیدیں اور جسے چاہیں حرام قرار دیدیں) اس لئے کہ وہ جری لھم مثل ما جری لمحمد (ائمہ کو بھی وہی اختیارات حاصل ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تھے)۔

مولوی حضرات نے جو خاکہ پیش کیا ہے، اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ بالاتفاق طے پایا ہے۔ یعنی شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے نمائندوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ملک کا قانون کتاب اور سنت کے مطابق بنے، اور سنت کی تفصیل ان دونوں فرقوں کے نمائندوں کے نزدیک بالکل مختلف ہے۔ لہٰذا یہ بات قطعاً سمجھ میں نہیں آسکی کہ وہ کونسا دستور ہوگا جو احادیث کے مطابق بھی ہوگا اور دونوں فرقوں کے نمائندوں کے نزدیک متفق علیہ بھی۔

اس تفصیل سے ہمارے پیش نظر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قرآن کے ساتھ سنت کا التزام جذبات پرستی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ آپ جب خود انہی مولوی صاحبان سے کہیں گے کہ سنت کی عملی تعبیر واضح کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے ساتھ متفق نظر نہیں آئے گا۔ اس سے واضح ہے کہ آپ احادیث کی رو سے کوئی ایسا دستور بنا ہی نہیں سکتے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ساتھ اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ بھی مرتب فرما کر دے جاتے تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ سنت سے مراد وہ احادیث نبویؐ ہیں جو اس مجموعے کے اندر شامل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو قرآن کے ساتھ کوئی ایسا مجموعہ احادیث نہیں دیا جس سے صاف واضح ہے کہ وہ امت کے دستور کے لئے قرآن ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ لہٰذا آج سنت رسول اللہؐ سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے مطابق دستور مرتب کیا جائے کیونکہ حضورؐ نے اپنا دستور قرآن ہی کے مطابق مرتب فرمایا تھا اور یہی رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ اسی سنت کے مختلف پہلو سیرت رسول اللہؐ کے وہ عظیم اور جلیل واقعات ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ لہٰذا

کتاب و سنت سے مراد اللہ کی کتاب ہے جس کی اتباع رسول اللہؐ نے فرمائی۔ اسی قرآن کے مطابق ایسا دستور مرتب کیا جا سکتا ہے جو ہر مسلمان کے نزدیک قابل قبول ہو کیونکہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی مسلمان کو کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔

شق ۵ میں لکھا ہے کہ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کر دے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

یہ اصول نہایت مبارک و مسعود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ

(ا) شق ۲ میں لکھا ہے کہ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے، اور

(ب) شق ۹ میں یہ مذکور ہے کہ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا اور وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔

یعنی ان مولوی صاحبان کے بنیادی اصولوں کی رو سے ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر **مادی** امتیازات کے ابھرنے کی راہیں تو مسدود کی جائیں گی تاکہ ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام ہو سکے، لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کو مسلمہ حیثیت دی جائے گی اور ان کیلئے ایسی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں گی کہ جن سے فرقہ بندی کی یہ دیواریں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں، ایسی بات دنیا میں مولویوں کا گروہ ہی کر سکتا ہے۔

غور فرمایئے وحدت ملت کو پارہ پارہ کر دینے اور امت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ دینے کی ذمہ داری فرقہ بندی پر ہے۔ یہی وہ لعنت ہے جس نے ایک خدا، ایک رسول، ایک ضابطۂ قانون، ایک آئیڈیالوجی کے باوجود مسلمانوں کو کبھی ایک نہیں ہونے دیا۔ فرقہ بندی کو قرآن نے بنص صریح شرک قرار دیدیا۔ اس کا ارشاد ہے ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا (۳۰/۳۲) "اے مسلمانو کہیں توحید پر ایمان لانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقوں میں بٹ گئے۔" ایسا کرنے والوں کے متعلق قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح طور پر فرما دیا کہ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شئ (۶/۱۵۹) "اے رسول، جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقوں میں بٹ گئے، تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں۔" فرقہ سازی کو قرآن نے خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ (۶/۶۵) یہ ہیں خدا کے ارشادات۔ لیکن ان کے مقابلہ میں مملکت پاکستان کے اکتیس علماء کا یہ مجمع ہے کہ اس شرک کی بنیادوں کو آئینی طور پر مستحکم کرنے کی سفارش کر رہا ہے

اور اس عذاب خداوندی کی "مسلمہ اسلامی" حیثیت تسلیم کئے جانے کو رحمتِ خداوندی قرار دے رہا ہے۔ ان کے نزدیک "مادی امتیازات" کی رو سے پیدا شدہ تفرقہ خدا کی لعنت ہے اور اسے دور کرنا ایک اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ۔ لیکن مذہب کے نام پر تفرقہ انگیزی اور گروہ سازی عین خدا اور رسول کے حکم کی تعمیل ہے جس کی تکمیل ان حامیانِ شرعِ متین کے مقدس ہاتھوں سے ہو رہی ہے۔

ان حضرات نے بار بار "مسلمہ اسلامی" فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر سن رکھئے، مسلمہ ـــ اسلامی ـــ فرقے! کیا ہم اتنا پوچھنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ کون کون سے فرقے مسلمہ ہیں اور ان کے مسلمہ ہونے کی سند کیا ہے؟ اور یہ بھی کہ ان میں سے کون کونسا فرقہ اسلامی ہے اور کون کون سا غیر اسلامی؟ اور کیا ہم یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ اسلام تفرقوں کو مٹا کر امت واحدہ بنانے کیلئے تھا یا امت واحدہ کو فرقوں میں تقسیم کرنے کیلئے؟ ان "مسلمہ اسلامی" فرقوں میں سے کون کون سا فرقہ رسول اللہؐ کے زمانے میں موجود تھا؟ کیا ان فرقوں کا وجود سنت رسول اللہؐ کے عین مطابق ہے یا بدعت؟

ان حضرات کو محراب و منبر پر دیکھئے تو واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً سے لے کر کل مومن اخوۃٌ کی تمام آیات اور انہی کے مطابق ارشادات رسول اللہ صلعم جھوم جھوم کر اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر تلاوت فرماتے ہیں اور عمل کی یہ حالت ہے کہ ملت کے فرقوں کو آئینی حیثیت سے مستحکم کرنے کی تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ یہ ہے نمونہ ان کی اتباعِ کتاب و سنت کا۔ اصل یہ ہے کہ مولوی صاحبان کا وجود ہی فرقہ پرستی سے وابستہ ہے۔ اگر فرقے مٹ جائیں تو مولوی کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں نہ کوئی فرقہ تھا اور نہ کوئی مولوی۔ فرقے اور مولوی دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا جس آئین کا خاکہ مولوی صاحبان کے ہاتھوں مرتب ہو گا اس میں فرقوں اور مولویوں دونو کے وجود کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ فرقوں کی مسلمہ حیثیت کے متعلق آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اب مجوزہ دستور پاکستان میں مولوی کی حیثیت ملاحظہ فرمایئے۔ شق ۹؎ جس کا کچھ حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے، اس طرح درج ہے:

> مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ انھیں اپنے پیرووں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہو گا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے، اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہو گا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

لیجئے ہر فرقے کے مولوی صاحبان کیلئے معاش اور منصب کا انتظام ہو گیا۔ ساری مملکت میں یہ قاضی ہوں گے اور انہی میں سے قاضی القضاۃ ہو گا۔ پھر انہی میں سے مفتی صاحبان ہوں گے۔ پھر قاضی اور مفتی تیار کرنے کیلئے حکومت کی طرف سے درسگاہیں کھولی جائیں گی جن میں یہی حضرات اساتذہ ہوں گے۔ غور فرمایا آپ نے کہ کس طرح ایک ہی سفارش میں ان کی دنیا بدل گئی ہے۔

یہ تو رہا ان کے وجود کے متعلق۔ لیکن اس سے بھی زیادہ جگر خراش حقیقت ایک اور ہے۔ طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ حضرات کچھ اس قسم کا تصور پیش کریں گے کہ پرسنل لا الگ ہو اور حکومت کے قوانین الگ ہوں۔ دیکھ لیجئے

وہ خطرہ کس طرح لفظاً لفظاً درست ثابت ہو رہا ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو عہدِ رسالت مآبؐ و صحابہ کبارؓ کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت میں پیدا کیا گیا اور جو اسلام جیسی غیر منقسم وحدت میں ثنویت (Dualism) کا باعث بنا۔ یہی وہ ثنویت تھی جو آج تک مسلمانوں میں جاری رہی اور جسے ہماری جنگِ آزادی کے دوران میں نیشنلسٹ علماء بڑھ چڑھ کر پیش کرتے رہے، اور یہی ہے وہ تصور جو اب اس اجتماع کی طرف سے پیش ہو رہا ہے جس کے صدر سید سلیمان ندوی صاحب ہیں۔ ایک مسلمان کے لئے "شخصی معاملات" اور "غیر شخصی معاملات" کی تفریق خدا اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مرادف ہے۔ یہ تفریق انگریز کی حکومت میں قابلِ فہم تھی۔ یہ تفریق آج بھارت کی حکومت میں بھی قابلِ فہم ہے۔ ان کے ہاں مملکت لادین (Secular) ہے۔ وہاں مملکت کا قانون کسی غیر متبدل آسمانی ضابطے کے تابع نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہاں مذہب کا دائرہ صرف شخصی معاملات تک محدود رکھا جاتا ہے۔ لیکن قیامت ہے کہ اکتیس علمائے کرام کی یہ بھیڑ اسلامی مملکت کے "بنیادی اصول" کے عنوان سے ایک خاکہ مرتب کرتی ہے اور اس میں لکھا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کی فقہ کی رو سے ہوں گے۔

یہیں سے آپ اس حقیقت پر بھی غور کر لیجئے کہ مولوی صاحبان کے نزدیک "فقہ" سے مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کے قوانین کے مجموعہ کو فقہ کہا جائے گا جس میں بین الاقوامی معاملات سے لیکر نکاح و طلاق تک سب کچھ شامل ہوگا۔ لیکن ثنویت کے ان علمبردار مولوی صاحبان کے نزدیک فقہ کا تعلق صرف شخصی معاملات سے ہوتا ہے اور مملکت کے دیگر معاملات کا تعلق مملکت کے قانون سے ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ثنویت کے زہریلے جراثیم کس طرح ان لوگوں کی رگ و پے میں سرائیت کئے ہوئے ہیں۔

یاد رکھئے ایک اسلامی مملکت جو اپنے دستور کی بنیاد ضابطہ خداوندی پر رکھتی ہے، جو قانون بھی مرتب کرے، وہ اس کی فقہ میں شامل ہوتا ہے اور اس میں پرسنل اور غیر پرسنل معاملات کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اسلام ہی آئینِ وحدت سکھانے کیلئے آیا تھا اور اس کے علاوہ ہر دعوت جو ملت میں کسی قسم کے تفرقے کی موید ہو عصبیتِ جاہلیہ کی دعوت ہے، خواہ وہ کیسے ہی بزعمِ خویش مقدس حلقوم سے کیوں نہ نکلے۔

شق ۱۷ میں یہ کہا گیا ہے کہ مملکت تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں۔

پہلا سوال زیرِ غور یہ ہے کہ جب مملکت کے رزق کے سرچشمے "بے حد و نہایت" افراد کی ملکیت میں ہوں تو مملکت اپنے اس فریضے کو پورا کس طرح کرے۔

دوسری چیز قابلِ غور یہ ہے کہ اس اصول کے تابع مملکت صرف ان لوگوں کے رزق کی ذمہ دار ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں، لیکن آج دنیا کی معاشی حالت یہ ہو گئی ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو رزق کمانے کے قابل تو ہیں لیکن انھیں کوئی کام نہیں ملتا۔ مملکت کا یہ بھی فریضہ ہے کہ تمام افرادِ کاسبہ کے لئے کام مہیا کرے، بلکہ اس کی اصلی صورت یوں ہے کہ تمام افرادِ مملکت کے رزق

کی ذمہ داری مملکت کے سر ہے اور افراد کا سبہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی حسب استطاعت کام کریں۔ یہ ہے صحیح قرآنی نظام ربوبیت۔ لیکن اس میں چونکہ افرد کے پاس "بے حد و نہایت" وسائل پیداوار نہیں رہتے اس لئے مولوی صاحبان اس قرآنی تصور معاش کو کمیونزم قرار دے کر اسے جہنم کا شجرۃ الزقوم ٹھہرا دیتے ہیں۔

شق ۷ میں مذہب و مسلک کی آزادی کی سفارش کی گئی ہے۔ کیا ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ احادیث کی رو سے جو مرتد کی سزا قتل بتائی جاتی ہے، اس میں آزادئ مذہب کہاں تک باقی رہتی ہے۔ مذہب کی آزادی خالص قرآنی قانون ہے جو مولوی صاحبان کے نزدیک بہت بڑی گمراہی ہے۔ معلوم نہیں آزادئ مذہب کی سفارش کرتے وقت یہ مولوی صاحبان حدیث کے اتنے بڑے اہم حکم کس طرح نظر انداز کر گئے۔

کیا یہ تسامح ہے یا مصلحت بینی؟

شق ۱۱ میں یہ لکھا گیا ہے کہ مذہب و مسلک اور اظہار رائے کی آزادی میں غیر مسلم بھی برابر کے شریک ہونگے لیکن شق ۲۰ میں یہ بھی مسطور ہے کہ

ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

مملکت اسلامی کا اساسی اصول توحید ہے۔ کیا غیر مسلموں کو اپنے مشرکانہ عقائد کے اظہار کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ اگر اجازت ہوگی تو وہ شق ۲۰ کے خلاف جائے گی اور اگر اجازت نہیں ہوگی تو وہ شق ۷ سے متصادم ہوگی۔

شق ۱۴ میں مذکور ہے کہ رئیس مملکت یا ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لیکر اپنے فرائض انجام دیگا۔

یہاں یہ نہیں واضح کیا گیا کہ رئیس مملکت کیلئے اس مشورے کی پابندی ضروری ہوگی یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ خاموشی دانستہ ہے۔ غالباً مولوی صاحبان کا اس باب میں اتفاق نہیں ہو سکا۔ مختلف مذاہب کے نمائندے تو ایک طرف، ان کی تو یہ حالت ہے کہ خود ہی ایک وقت میں کچھ کہتے ہیں اور دوسرے وقت میں کچھ اور۔ مثلاً اس اجتماع میں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بھی شریک تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ اول میں (اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ اگر رسول اللہ صلعم کی ہر بات وحی کی رو سے ہوتی تھی تو آپ مشورہ کرنے پر کیوں مامور تھے) لکھا تھا کہ رسول اللہؐ کی حیثیت دوسرے امرائے ملت کی سی نہیں ہے۔

دوسرے امراء کیلئے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورے سے کام کریں، اور یہ کہ اگر اہلِ شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کریں۔ لیکن رسول اللہؐ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہاں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ آپ جب کسی بات کا عزم فرمائیں تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام فرمائیے۔ (صفحہ ۲۴۴)

یعنی رسول اللہ صلعم صرف مشورہ کرنے کیلئے مامور تھے، مشورہ کی پابندی پر مجبور نہ تھے، لیکن دوسرے امرائے امت پر مشورے کی پابندی لازمی ہوگی۔ لیکن انہی مودودی صاحب نے جب دستوری خاکہ مرتب فرمایا تو اس میں یہ لکھا کہ

> امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق ہوگا کہ وہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

یعنی پہلے جو چیز صرف رسول اللہ کے لئے مختص تھی، اب وہی چیز ہر امیر امت کے لئے عام ہوگئی۔ (شاید اس لئے کہ اس وقت خود مودودی صاحب ہنوز مقام امارت پر فائز نہیں ہوئے تھے۔)

بہرحال اتنی سفارش کہ رئیسِ مملکت نمائندگان جمہور سے مشورہ لیکر اپنے فرائض سرانجام دیگا بالکل مبہم ہے۔ اگرچہ شق ۱۵ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس پر مشورہ کی پابندی لازمی ہوگی کیونکہ اس میں یہ لکھا ہے کہ رئیس مملکت کو حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزاً معطل کرکے **شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔**

یہ ہے مختصر سا مرقع ان کوششوں کا جو مملکت پاکستان کے مختلف فرقوں کے علمائے کرام نے متحدہ اور متفقہ طور پر مملکت پاکستان کے دستور کے بنیادی اصول مرتب کرنے میں ارزاں فرمائیں۔ ان کے مرتب کردہ خاکے پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ اس میں کوئی چیز ایسی ہے جس میں کسی فکر کی جھلک نظر آرہی ہو۔ ان لوگوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کی سیادت اور قیادت عام نہیں ہو رہی لیکن یہ کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے ان کے پاس ہے کیا جس کی بنا پر یہ اپنے آپ کو مسلمہ قیادت کا مدعی ہی نہیں بلکہ اجارہ دار سمجھتے ہیں۔ جہاں تک سطحی مذہبیت کا تعلق ہے عوام بیشک ان کی پیشوائیت کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آتا ہے جس میں انھیں عوام کی سطح سے ہٹ کر کچھ کہنا پڑے تو وہ اسی قسم کا ہوتا ہے جیسا بنیادی اصولوں کا یہ خاکہ ہے جو انھوں نے مرتب فرمایا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں دستورِ پاکستان کی تشکیل کا سوال مسلمانانِ پاکستان ہی کیلئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کیلئے نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے صدر اول کے بعد یہ پہلا وقت آیا ہے کہ جس میں یہ طے پایا ہو کہ مسلمانوں کی ایک مملکت کا دستور اسلامی اصولوں کے مطابق مرتب کیا جائے۔ مسلمان ساری دنیا کو صدیوں سے یہ سناتے چلے آئے ہیں کہ انسانیت کی تمام مصیبتوں کا حل اسلام میں موجود ہے۔ اس وقت تک اس دعوے کے پرکھنے کا کوئی موقع نہیں آیا۔ اب پہلی بار اس کا موقع آیا ہے اس کیلئے جو کچھ اربابِ حکومت کی متعینہ کمیٹی نے پیش کیا وہ بھی ہمارے سامنے آچکا ہے اور اسے مسترد کرنے کے بعد جو کچھ علمائے کرام کی طرف سے آیا وہ ان بائیس نکات کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ آپ یکسر غیر جانبدار ہوکر ذرا سوچئے کہ کیا یہ خاکہ ہمارے اس دعوے کا ثبوت بن سکتا ہے کہ اسلام نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان نکات میں کونسی بات ایسی ہے جسے ایک عامی سے عامی مسلمان بھی نہیں جانتا؟ کتاب وسنت کے الفاظ سے کون ناواقف ہے۔ چٹاگانگ سے

لیکر پشاور تک کے اطراف واکناف پاکستان سے چوٹی کے علمائے کرام کا اجتماع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اجتماع پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوا (اگرچہ اس کا ابھی تک علم نہیں ہو سکا کہ یہ روپیہ آیا کہاں سے، کیونکہ یہ اجتماع کسی جماعت یا ادارہ کی طرف سے منعقد نہیں ہوا۔ نہ ہی اس کیلئے کسی چندے کی اپیل کی آواز سنائی دی) اتنے صرف کثیر کے بعد علم وفضل کے واحد اجارہ داروں کی طرف سے کوئی چیز تو ایسی سامنے آتی جس سے کم ازکم کسی فکر کا نشان مل سکتا۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، اس میں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں یہ اس سے زیادہ کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ غلط عقائد، بے مقصد تعلیم اور ہمیشہ نظری مباحث کی موشگافیوں میں الجھے رہنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان کی قلب ونگاہ کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ اس میں عملی مسائل کے حل کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ وہ دوزخ کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کی دعائیں تو بتا سکتا ہے لیکن جس بھیانک جہنم میں انسانیت گرفتار ہے اس کے کسی ایک شعلے کو فرو کرنے کی تدبیر ان کے حیطۂ تصور سے بھی باہر ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ اپنے الفاظ کی افسانوی دنیا میں رہتے ہیں جسے ان کی اصطلاح میں "بسم اللہ کا گنبد" کہا جاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی ٹھوس دنیا سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ انھیں سکھایا یہ گیا ہے کہ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیشوائیت (Priesthood) کا پورے کا پورا تصوف نتیجہ ہے اس انتقام کا جو یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت نے مل کر اسلام سے لیا۔ آپ مسلمانوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے، ان کے انحطاط او رزوال کا سب سے بڑا موجب یہی فرقہ رہا ہے۔ یہی خدا اور بندے کے درمیان دیوار بن کر حائل ہے اور اسی نے مسلمانوں کی نگاہ سے قرآن جیسی انقلاب آفریں کتاب کو اوجھل کر رکھا ہے۔ خواہ کسی کو یہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ گزرے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جب تک یہ اکاس بیل شجر ملت سے الگ نہیں ہوتی اس درخت میں تروتازگی کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی است　　　باش تا بینی کہ انجام تو چیست

اسلامی مملکت کے دستور کے بنیادی اصول خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائے ہیں جو اس کی زندہ و پائندہ کتاب میں قیامت تک کیلئے محفوظ ہیں۔ انہی اصولوں کے مطابق جناب نبی اکرم صلعم نے اپنے عہد ہمایوں میں دستور مرتب فرمایا اور انہی اصولوں کے مطابق آج بھی ہر اسلامی مملکت کا مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہی دستور "کتاب وسنت" کے مطابق ہوگا کہ سنت بھی کتاب کے اندر ہے باہر نہیں ہے۔ اگر پاکستان کے مسلمانوں نے فی الواقع اسلامی اصولوں کے مطابق دستور بنانا ہے تو انھیں یہ دستور قرآن کے اصولوں کے مطابق بنانا ہوگا، اور اگر یہ سعادت ان کی قسمت میں نہیں لکھی تو پھر انھیں چاہئے کہ جس طرح دنیا کی دوسری قومیں اپنی عقل وفکر کی بنا پر اپنے لئے دستور مرتب کرتی ہیں، اسی طرح یہ بھی اپنا دستور مدون کرلیں کہ اس سے اگر انھیں حیاتِ جاودانی نہیں تو کم ازکم دنیا کی حیاتِ مستعار تو مل جائیگی۔ لیکن اگر یہ مولوی کے پیش کردہ مذہب سے چپکے رہے تو خسر الدنیا والآخرہ کے سوا اس کے نصیب میں اور کچھ نہ ہوگا۔

واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

باب المراسلات

افغانستان کا نظامِ اسلامی

طلوعِ اسلام میں بارہا اس کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ مولوی صاحبان کا تصورِ اسلام سے متعلق کیا ہے اور جب اسے بطور نظامِ مملکت رائج کیا جائے گا تو اس سے کیا نتائج مترتب ہوں گے۔ کابل سے ایک صاحب نے "مشتے نمونہ از خروارے" افغانستان کے "اسلامی" نظام کی بعض دفعات ارسال کی ہیں جنھیں ذیل میں من و عن درج کیا جاتا ہے۔ اس میں افغانستان کی تخصیص نہیں بلکہ مولوی صاحبان کے تصور کا نظام جہاں کہیں بھی نافذ ہوگا اس کے نتائج اس سے مختلف اور بہتر نہیں ہوں گے۔

پاکستان کے دستورِ اساسی کے ضمن میں، مملکتِ "اسلامی" افغانستان کے دستور (نظامنامۂ) اساسی کی چند شقیں اطلاعاً عرض کرتا ہوں۔ یہ نظامنامہ "بادشاہِ اسلام" نادر شاہ کی زیرِ ہدایات اکتوبر ۱۹۳۱ء میں مرتب و مروج ہوا تھا۔ میری دانست میں کسی تفسیری بیان کی ضرورت نہیں اس لئے کہ ملوکیت اور مولویت کے باہمی ارتباط اور عوام مسلمانوں کو اسلامیات سے بے بہرہ رکھنے کے نتائج کو آپ بخوبی اُجاگر کر چکے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ اگرچہ افغانستان کے مسلمان بالعموم پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں مگر انھیں معاشی مسائل اور روٹی کپڑے کے حصول کی الجھنوں نے قرآن کی طرف کما حقہ رجوع ہونے کا موقع نہیں دیا۔ حکومت کی اسلام دوستی اس سے واضح ہو جائیگی کہ یہاں آج سے شاید ایک سال پہلے قرآن پاک کے تراجم یا تفاسیر بکلی ناپید تھے اور نہ مکتب، مدرسہ یا مسجدوں میں اس روحانی غذا کی بہم رسانی کا کوئی انتظام تھا، اب بھی نہیں۔

شق اولی: افغانستان کا مذہب اسلام اور مملکت کا رسمی مذہب حنفی ہے، بادشاہ افغانستان کو اسی مذہب کا پابند ہونا لازمی ہے۔ دوسرے مذاہب کے پیروکار مثلاً ہندو، یہودی وغیرہ جو افغانستان میں سکونت پذیر ہوں مملکت کی حفاظت میں ہوں گے بشرطیکہ وہ مملکت کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کریں۔

شق ۵: اعلیٰحضرت نادر شاہ کی خدمات کے پیشِ نظر ان کو بحیثیت بادشاہ منتخب کیا جاتا ہے، اس کے بعد ان کی اولاد نرینہ یا بھائی بادشاہ بنیں گے۔

شق ۶: کے مطابق بادشاہ کو تخت نشینی سے پہلے خدا اور قرآن پر حلف اٹھانا ہوگا کہ وہ شرعِ محمدی اور دستورِ اساسی کے

مطابق حکومت کریگا اور اس میں وہ اولیائے کرام کی ارواح مقدسہ سے بھی استمداد کریگا۔

شق ۷: نماز جمعہ کے خطبہ میں بادشاہ کا نام ہوگا اور وہ شریعت اور قانون ملکی کے تحفظ اور ترویج کا ذمہ دار ہوگا۔

شق ۱۰: افغانستان کے جملہ باشندے شریعت کے مطابق جملہ حقوق سے برخوردار ہوں گے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی ساتھ حکومت کے اوامر و نواہی کے پابند ہوں گے۔

شق ۱۲: باشندگان افغانستان تجارت، صنعت اور زراعت کے قوانین کی حدود میں رہتے ہوئے کاملاً آزاد ہوں گے۔

شق ۱۳: جملہ باشندگان افغانستان کے حقوق و فرائض شریعت اور قوانین مملکت کے ماتحت ایک جیسے ہوں گے۔

شق ۱۵: ہر باشندہ کی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ محفوظ ہوگی۔ اگر کسی وقت حکومت کو کسی غیر منقولہ جائیداد کی مفاد مملکت کیلئے ضرورت پڑے تو اس کے مالک کو اس کی قیمت شریعت اور قانون خصوصی کے ماتحت ادا کر دی جائے گی۔

شق ۱۶: ہر شخص کا گھر ہر قسم کی مداخلت سے مامون ہوگا، کوئی سرکاری یا غیر سرکاری شخص دوسرے شخص کے گھر میں داخل ہونے کا مجاز نہ ہوگا الا اس صورت میں کہ اس کے پاس شریعت یا قانون مملکت کے ماتحت اجازہ نامہ ہوگا۔

شق ۱۹: قانون مملکت یا قوانین شرعی کے ماتحت ہی کسی شخص کو سزا دی جا سکے گی۔

یہ مشتے از خروارے ہے۔ شریعت یا قانون مملکت کی تعریف یا تخصیص کہیں بھی نہیں کی گئی۔ عملی دنیا میں شریعت یا قانون مملکت کے ماتحت انصاف گستری کی نوعیت افغانستان کی عدالتوں میں اسلام اور شرع پیغمبر کو رسوا کرنے کی بدترین مثال ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں ایک مفروضہ "جنایت کار" (Carimnal) کو قاضی صاحب نے "شریعت" کے مطابق بالکل بری قرار دیا مگر قانون مملکت کے ماتحت اُسے اسی مفروضہ جرم کی پاداش میں پانچ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی اور اس کا گھر بار جائیداد وغیرہ بحق سرکار ضبط۔

کتابیں

تعارفِ قرآنی	۱/۱۲/-
دکھیا سنسار	۲/۸/-
اشک وتبسم	۳/-
حرف اقبال	۳/-
بچوں کی نفسیات	۱/۱۲/-
نوجوانوں کی نفسیات	۳/۱۲/-
نوجوانوں کی جنسی مشکلات	۳/-
باقیاتِ فانی	۳/-
مقالات اسلم	۴/-
مجاہد مراکش	۳/۸/-
تعلیماتِ قرآن	۶/۸/-
قاموس المشاہیر حصہ اول	۸/-
" " حصہ دوم	۸/-
حیات المسلمین	۴/۸/-
مسلمانوں کا نظم مملکت	۵/-
تاریخ اسلام	۷/۱۲/-
" "	۵/-
دو اسلام	۲/۸
دو قرآن	۲/۸
ماں	۷/-

الدین القیم	۲/۱۲/-
تاریخ جرم وسزا تین حصے	۱۵/-
سیرِ افغانستان	۲/۸
نگارستان	۴/-
جمالستان	۵/۸
تبلیغِ دین	۳/-
خاتم الانبیاء	۱/۸
شخصیت اور کردار	۲/۸
فلسفۂ عجم	۳/۲
جہانِ نو	۲/۸
اسلام کا نظامِ حیات	۴/۴
اسلام کا نظامِ عدالت	۲/۱۲
خطبات نبوی	۲/-
اسلام اور سود	۳/۸
سید البشر	۱/-
عروج وزوال	۳/-
اسلامی تہذیب کیا ہے	۳/-
تعمیرِ حیات	۴/-
طارق	۶/۱۲
حیاتِ نبی	۱/۸
قوتِ ارادی	۳/۴
روایات اور بغاوت	۳/-
مکالمات ابوالکلام	۳/۱۲

شبلی نامہ	۳/-
اقبال کی نئی تشکیل	۶/۸
رودِ کوثر	۵/-
معراجِ انسانیت	۲۰/-
تاریخ رسالت	۱۵/-
نظامِ نو	۱/۸/-
اقبال اور قرآن	۵/-
معاشیات قومی	۸/-
اسلامی معاشیات	۷/۱۲
اسلام کا نظریۂ جہاد	۲/-
اسلام میں امامت کا تصور	۱/۸
مردِ مومن	۲/۴
سیرتِ اقبال	۶/۸
آثارِ اقبال	۳/۱۲

بچوں کے لئے

فرزندِ سرحد	-/۱۰/-
قدردان -/۴/- قرض	-/۶/-
لفٹیننٹ	۱/-
فل بوٹ	۱/۸
کشمیر کی کہانیاں	۳/-
اسلامی باتیں -/۵/- ، پاکستان کے گیت	-/۸/-

کتاب لمیٹڈ ۔ رابسن روڈ ۔ کراچی

انفرادی ملکیت اور قرآن

(حکیم ابوالنظر صاحب رضوی امروہوی)

انسانیت کی پچھلی تاریخ میں مسئلۂ ملکیت کی حیثیت ایک انفرادی مسئلے سے زیادہ نہ تھی۔ شخصی آرزوؤں کو پورا کرنے اور شخصی تضاد کو مٹانے کی حد تک مسئلۂ ملکیت سے دلچسپی لی جاتی تھی۔ لیکن آج جبکہ تمدنی ارتقاء شخصی وحدتوں کو اجتماعی وحدت میں گم ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے تاکہ افادیت پسندی کے فطری تقاضے کی تکمیل کی جا سکے اور باہمی ناخوشگواریاں دور کر کے امن و عیش سے آشنا۔ مسئلۂ ملکیت کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے زمانہ میں جذبۂ ملکیت کی تسکین اور باہمی اخوت وانصاف کو زندہ رکھنے کیلئے چند آئینی حدود بنا دینا پیچیدگیوں کو سلجھا دیتا تھا۔ لیکن آج مشینی دور میں اقتصادی مشکلات اور پیچیدگیوں کا حل کرنے کیلئے اس قسم کے ضابطے کافی نہیں ہو سکتے کہ فلیٹ پر جس کا قبضہ ثابت ہو جائے اسی کو الاٹ کر دیا جائیگا۔ یا جو شخص مکان بنانے کیلئے کسی قطعۂ زمین کا احاطہ کرلے اگر وہ سال دو سال کی مدت میں بھی مکان تعمیر نہ کریگا تو زمین دوسرے کو دیدی جائیگی۔ ہنگامی حالات کا مقابلہ یا بہت چھوٹے چھوٹے شخصی معاملات کو طے کرنے کیلئے ایسے حدود مناسب کہلائے جا سکتے ہیں لیکن ان قاعدوں کا نام ابدی قانون، بنیادی اصول، حدود اللہ رکھ دینا قانون ساز ذہن وفکر کی توہین کرنا ہے۔

جن حضرات نے آج کے معاشی سوالات کا مطالعہ کیا ہوگا اور انسانی شعور و تجربہ کے نئے سے نئے حل بھی دیکھے ہونگے۔ وہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ چند سادہ اور ابتدائی قاعدوں کو وقعت دی جا سکتی ہے۔ اگر کسی حد بندی سے معاشی نشوونما کی رفتار تیز نہیں ہوتی اور سوسائٹی کے تقاضوں کو زیادہ سے زیادہ مکمل کرنے کے مواقع نصیب نہیں ہوتے تو اُسے آپ چاہے کتنے ہی بلند تر شعور سے نسبت کیوں نہ دے رہے ہوں، انسانی دماغ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا: "فاصبحوا بکافرین" کا نعرہ قوم موسیٰؑ ہی کیلئے مخصوص نہیں۔ حالات بگڑتے ہوئے دیکھ کر کوئی قوم بھی طے شدہ ضابطہ کا پابند رہنا گوارہ نہیں کر سکتی چاہے وہ بنیادی طور پر اس قانون کو منصفانہ حل ہی کیوں نہ تسلیم کرتی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن نے قوم موسیٰؑ کی تاریخ پیش کر کے پیغمبر اسلامؐ کی رہنمائی پر یقین رکھنے والوں سے مطالبہ کیا کہ وہ وقت کا تقاضہ پیدا ہونے سے پہلے قانونی دفعات طے کرا لینے کی جدوجہد ترک کر دیں۔ جن آئینی پہلوؤں کو بغیر متعین کئے ہوئے چھوڑ دیا گیا ہے انھیں وقت سے پہلے طے کرا لینا نفاذِ قانون کے وقت انکار پر آمادہ کر کے مومن سے کافر بنا سکتا ہے جیسا کہ پچھلی تاریخ میں تم دیکھ چکے ہو۔ کیا کفر و انکار کی راہ پر جانے سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ تم اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے جہاں تک ہو سکے حق پرستی پر قائم رہنے کی کوشش کرتے رہو۔ بار بار سوچئے کہ قرآن کے خدا کا انسانی شعور و تجربہ کی کمزوریوں کو جانتے ہوئے جوابات متعین کرا لینے سے منع کرنا کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جدوجہد کی سمت درست رکھتے ہوئے غلطیوں سے گذرنا خدا کے نزدیک بغاوت نہیں۔ بظاہر ہر سوال اور ہر شبہ کا وحی سے متعین کرا لینا موزوں ترین راستہ تھا۔ مگر انسانی فطرت اس کے گوناگوں ماحولی رجحانات کو جاننے والا خدا، اس مناسب طریقۂ کار کو پسند نہیں کرتا۔ بساطِ زندگی کا ہر مہرہ اور اس کی ہر چال اگر استاد کی طرف سے مقرر کر دی جائے تو شاگرد ساری عمر بھی اپنے بھروسہ پر شطرنج نہ کھیل سکے گا اور بازی جیت لینا تو اس کیلئے ممکن ہی نہیں۔ خدا اور اس کا قانونِ پروردگاری انسانی صلاحیتوں کو نشوونما دینا چاہتا ہے نہ کہ انھیں سلب کرنا۔ وہ ہر طرح سے پابند کر کے انسانیت کو ارتقاء سے محروم نہ کر سکتا تھا اسی لئے اس نے

رہنمائی کیلئے ایسا انداز اختیار کیا جو ارتقاء کے راستہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

اگر ہمارے مفکرینِ اسلام کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وحی اور انسانی شعور کا باہم کیا ربط ہے؟ اور شعور اپنی آزادی کو قائم رکھتے ہوئے کیونکر وحی کی رہنمائی سے منزل تک پہنچنے کے قابل ہو سکتا ہے تو اس کمزوری کو چھپانے کیلئے انھیں کم از کم اتنا شاعرانہ مبالغہ نہیں کرنا چاہئے کہ انسانی شعور و تجربہ کو طنز آمیز قہقہہ لگانے کا حق ہو جائے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں اور بڑے افسوس کے ساتھ کہ ہمارے وہ "صالحین" جنھیں اپنے اجتہاد، اپنے طرزِ تفقہ اور اپنی مذہبی رہنمائی پر ناز ہے سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی خاطر برابر بلند بانگ دعوے کر رہے ہیں۔ کاش اس بلند آہنگی میں طاقت، ٹھوس پن، محکمی اور صداقت ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ ہندوستان کے تمام علماء کرام کے مقابلہ میں اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لئے علامہ مودودی صاحب نے یہ تو کہدیا کہ

> بدقسمتی یہ ہے کہ علماءِ اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علما کی جماعت اب بھی اُسی روش پر قائم ہے جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہارِ نفرت تو جتنا جی چاہے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کیلئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ اسلئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔
>
> (تنقیحات ص۳۰ "دورِ جدید کی بیماریوں")

دوسری جگہ اس مقام سے بھی بلند تر پرواز کرتے ہوئے علامہ مودودی ارشاد فرماتے ہیں:۔

> اسلام میں ایک نشأۃ جدید (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کو اب اُلٹے پاؤں اُن منازل کی طرف واپس لیجانا ممکن نہیں ہے۔ جن سے وہ چھ سو برس پہلے گذر چکی ہے۔ علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر و محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و انکشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظامِ فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمتِ طبیعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے۔ (تنقیحات ص۱۵ "ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب")

لیکن اگر آپ علامہ موصوف کے پندرہ سالہ "طباعتی کاروبار" کا جائزہ لینے کی کوشش کریں تو اس فیصلہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جو طنز "علماءِ دین" پر کیا گیا تھا وہ خود ان ہی کی طرف واپس آ گیا۔ جدید معاشی حالات کے نتیجہ میں جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل ہو گئے تھے وہ جس حد تک علماء کرام کی قدیم طرزِ فکر سے حل ہو چکے تھے ایک قدم بھی اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ نہ معلوم کتنے نئے سوالات ہیں جن پر علماء کرام سالہا سال مذہبی لٹریچر پیش کرتے رہے۔ علامہ شبلی کے نقشِ قدم پر دارالمصنفین اعظم گڈھ چلتا رہا اور قاسمی طرزِ فکر کو اجاگر کرنے کیلئے ندوۃ المصنفین دہلی۔

علامہ موسیٰ جاراللہ صاحبؒ نے نئے سوالات کو حل کرنے کیلئے عربی میں ضخیم مجلدات مرتب فرمائیں۔ علامہ سندھی مرحوم نے ایک نئے فکری ادارہ کے ذریعہ سنہ ۱۹۱۱ء سے نئے مسائل کو حل کرنے کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زاویۂ نگاہ کو نئے مسائل حل کرنے کیلئے موزوں ترین یقین کرنے کی بنا پر انھوں نے اسی نقطۂ نظر کے سایہ میں ڈھائی ہزار صفحات کی تفسیر قرآن بھی املا کرا دی جو ممکن ہے کہ حکومت سندھ کی توجہ سے جلد شائع ہو سکے۔ احادیث، تاریخ اور جدید انکشافات کے سہارے حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، اور دوسرے اہلِ قلم قرآن پر بھی ضخیم مجلدات مرتب کر چکے اور مودودی ترجمان القرآن سے کہیں بلند تر علم وادب کی روشنی ہیں۔

مذہبی مشاغل پر اکتفا نہ کرتے ہوئے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے بھی نہ صرف سید احمد شہید صاحبؒ کے زمانہ میں بلکہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ سے لیکر برطانوی اقتدار اٹھ جانے تک علمار کرام کی جماعت برابر ایثار پیشگی کے ساتھ قربانیاں پیش کرتی رہی۔ ہمارے علامہ مودودی جو "نشاۃ جدیدہ" اور نئی زندگی پیدا کرنے کی دعوت دے رہے ہیں، کیا بتا سکیں گے کہ اپنی تمام پچھلی تاریخ میں نشاۃِ جدیدہ کیلئے کونسی جدوجہد یا فکری اجتہاد کے شاہکاروں کی نمائش کرتے رہے تھے۔ ان علمار کرام پر طعنہ زنی جو اپنی بساط، قدیم طرزِ فکر کی پرواز اور تاریخی پس منظر کی حد تک سب کچھ کرتے رہے۔ اور اس شخص کی طرف سے جس کا پورا لٹریچر بھی کسی ایک مسئلہ کا حل پیش نہ کر سکا ہو اور جس نے پارٹی اقتدار کے علاوہ نہ علمار دین ہی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہو، نہ مسلم اقتدار ہی کے لئے کوئی جدوجہد کی ہو، نہ متحدہ قومیت ہی کی بساط کے لئے کچھ مہرے چُنے ہوں، نہ اپنے طرزِ فکر کے سایہ میں کوئی دستور اساسی اور ہمہ گیر معاشی نظام ہی پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ وہ تمام کمزوریاں جنھیں علمار کرام کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے کیا اسلامی جماعت کے ہر رکن میں نہیں پائی جاتیں اور کیا کوئی ایسی خوبی اس جماعت میں بتائی جا سکتی ہے جس سے ہمارے علمار کرام کی جدوجہد یکسر خالی ہو۔ سیاسی پلیٹ فارم پر نمایاں ہونے کیلئے شخصی نقوش کو ابھارنا اور بات ہے اور حقیقت میں کسی شخصیت کا نمازترین ہونا اور بات۔ میں چیلنج کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کوئی ایک پیچیدہ مسئلہ بھی اسلامی جماعت حل نہ کر سکی جس تک ہمارے دوسرے علمار دین کی مذہبی فکر نہ پہنچی ہو۔

بیا و رید گر ایں جا بود سخندانے

آپ تمام دیگر سوالات اور پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اسلام کے اقتصادی نظام پر اسلامی جماعت کی ریسرچ ملاحظہ فرمایئے اور پھر بتایئے کہ جس فقیہانہ فکر و نظر کے سایہ میں ہماری وہ تاریخ گذرتی رہی جسے اسلامی جماعت بھی ملوکیت پرستانہ اور باطل قرار دیتی ہے کیا اس سے ذرہ برابر بھی اختلاف رکھنے والا اقتصادی نظام پیش کیا جا سکا۔ زراعتی نظام کے آئینی پہلو کو اس سے بہتر طور پر سلجھایا جا سکا۔ جسے ہمارے قدیم مفکرین کا ناخنِ تدبیر سلجھا چکا تھا۔ بنی امیہ اور بنی عباس کی خلافت، علامہ موصوف کے نزدیک اہلِ بدعت کی حکومت تھی۔ حالانکہ انھوں نے مسائل کا حل جس اندازِ فکر کے زیرِ سایہ کیا تھا۔ اسی کو اسلامی جماعت بھی ابدی قانون کا ترجمان قرار دیتی ہے۔ صرف اتنا فرق سمجھ لیجئے کہ اندلس جیسی بنجر زمین کو چمن در چمن اور اپنے تاریخی دور میں بہترین سائنٹفک زراعتی سسٹم بنا دینے والے بنی امیہ نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اسے باطل پرستی قرار دینے والی اسلامی جماعت سندھ اور پنجاب کے ان زمینداروں کی پاسبانی کر رہی ہے جو کاشتکاروں سے سجدے کراتے رہتے ہیں اور صرف اس "پروردگاری" کے بدلہ میں کہ کسی کاشتکار کو اپنا جھونپڑا تک بنانے کا اختیار نہ دیا جا سکا۔ سالہا سال سے جن "اہلِ سنت زمینداروں" نے لاکھوں آدمیوں کو غلام، ننگا بھوکا اور جہنمی دھوپ کا ایندھن بنا رکھا ہے، ان سے نیک توقعات قائم کی جا رہی ہیں اور جن کاشتکاروں کو ہمیشہ لوٹ کھسوٹ کا شکار بنایا جاتا رہا انھیں اپنی زمینوں کا مالک ہونے کی

اجازت نہیں دی جارہی۔ کیونکہ خدا کی ناراضگی کا سخت اندیشہ تھا۔ کیا سنہری توقعات میں الجھائے رکھنے کا نام نیک عملی ہے۔ اور کیا اس نیک عملی سے یورپ اور ایشیا کے کسی سرمایہ دار کو بھی تہی دامن بنایا جاسکتا ہے۔ خدا کیلئے یہ تو بتائیے کہ ہمارے علماء کرام نے اقتصادی مسئلہ کا وہ کونسا پہلو صاف نہیں کیا تھا جسے علامہ موصوف کے اجتہاد نے جگمگا دیا، وہی نغمہ ہے اور وہی ساز، جسے ہمارے علمائے کرام چھیڑتے رہے۔ مگر دعویٰ یہی کیا جاتا ہے کہ نہیں جو کام ہم کر رہے ہیں وہ آج تک کسی دوسرے سے نہ ہو سکا۔

آپ "مسئلہ ملکیت زمین" کا مطالعہ فرمایئے یا ترجمان القرآن کے پرچوں کا، کہیں بھی آپ کو اتنی سی بات کا پتہ نہ چل سکے گا کہ ملکیت جیسے پیداواری قوانین سے، وحی والہام کی ہمہ گیر رہنمائی کو بنیادی طور پر کوئی دلچسپی بھی ہے یا نہیں۔ "مسئلہ ملکیت زمین" جس کتاب کا نام ہے اس میں سب کچھ ہے سوائے "مسئلہ ملکیت" کے۔ بٹائی کے جائز و ناجائز ہونے پر موافق و مخالف احادیث بھی نقل کی گئی ہیں اور فقہاء کرام کے نتائج فکر بھی۔ اگر روشنی نہیں ڈالی گئی تو "ملکیت زمین" پر۔ چند قیاسات کا نام خدا کی رہنمائی میں مسائل کا حل رکھ دینے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور غالباً علامہ مودودی ایسا کرنے پر مجبور بھی تھے۔ کیونکہ وہ ہم جیسے ناآشنایانِ دین کو خواہ کیسے ہی فریب تخیل میں مبتلا کر دیں لیکن اپنی جگہ خوب جانتے ہیں کہ ایسے مسائل پر بحث و گفتگو سے وحی والہام کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اپنی ایک نشری تقریر میں فرما چکے ہیں:

> دولت کی پیداوار کے طریقے اور اس کی گردش کی صورتیں کیا ہوں؟ اسلام کو اس سوال سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ چیزیں تو مختلف زمانوں میں تمدن کے نشوونما کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا تعین انسانی حالات و ضروریات کے لحاظ سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ (اسلام کا نظام حیات۔ سلسلہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء)

جن لوگوں نے اشتراکی فلسفہ کا مطالعہ کیا ہوگا وہ جانتے ہیں کہ مولانا کا یہ اعتراف قرآن وحدیث کی روشنی میں نہیں بلکہ اشتراکیت کی رہنمائی میں پیدا ہوا تھا۔ اشتراکیت نے انسانی تاریخ کا معاشی نقطہ نظر سے مطالعہ کر کے جو نتیجہ نکالا تھا اور جس پر اپنے حرام و حلال کی بنیاد رکھی تھی علامہ موصوف بھی اسی کو وحی والہام کا نقاب اوڑھا کر پیش فرما رہے ہیں۔

پیداوار کے طریقوں اور سرمایہ کی گردش میں تمدنی نشوونما سے جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ بے اثر اور بے نتیجہ نہیں ہوتے، بلکہ ہر تغیر اپنے ساتھ نئے احکام کی ایک کتاب لاتا اور انسانیت کو اسی انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بغیر غلامی کے پیداوار کو بڑھایا نہ جاسکتا تھا۔ لیکن جب تمدنی نشوونما نے انسانی تاریخ کو جاگیرداری نظام تک پہنچا دیا تو غلامی کو کاشتکاری میں تبدیل کرنا پڑا حقوق میں اضافہ کرتے ہوئے۔ ایسے ہی جب سرمایہ داری اور کارخانہ داری کا زمانہ آیا تو خود سرمایہ دارانہ نظام کے تقاضوں نے جاگیرداری پر ضرب لگائی اور اسے کاشتکاروں کے بدلے مزدور پیدا کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایسے مزدور جو کاشتکاروں سے کہیں زیادہ حقوق رکھتے تھے

اس طرح غلامی کے دور سے لیکر سرمایہ داری کے زمانہ تک پیداوار کے طریقوں میں جو تبدیلی ہوتی رہی اس نے زندگی کے ہر گوشہ پر اثر ڈالا اور اسے ہر مرتبہ نئی صورت میں بدلتے ہوئے آگے بڑھا دیا۔ بین الاقوامی تغیرات نے زندگی میں جو تبدیلیاں کیں، یا اس ترقی کی بنیاد کیا تھی؟ سماج کا غیر شعوری ارتقاء۔

لہٰذا اب سوچنا چاہئے کہ اگر اسلام پیداوار کے ان نئے نئے طریقوں، گردش دولت کے نئے نئے سانچوں سے کوئی بحث نہیں کرتا۔ تو ظاہر ہے کہ ان تبدیلیوں سے تمدن کے جو پیمانے تبدیل ہوں گے ان سے بھی بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

یہ کیا کہ مے حلال یہاں ہو وہاں نہ ہو

مگر مصیبت یہ تھی کہ اگر اس چیز کو بھی تسلیم کر لیا جاتا تو وہ مفکرینِ اسلام جو "لمن الملک الیوم" کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ مذہبی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کی بنیادوں سے محروم ہو جاتے۔ بدقسمتی سے اس کا انکار بھی آسان نہ تھا۔ تمدنی نشوونما سے پیدا ہونے والے نئے سماجی ڈھانچوں سے اگر خدا کو دلچسپی نہیں تو پھر بتانا ہوگا کہ اس کی رہنمائی کا آغاز کون سے نقطہ سے ہوتا ہے اور کہاں تک اس کی روشنی سے تاریک فضائیں جگمگا اٹھتی ہیں۔ مودودی صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> انسان کی معاشی زندگی کو انصاف اور راستی پر قائم رکھنے کے لئے اسلام نے چند اصول اور چند حدود مقرر کر دیئے ہیں تاکہ دولت کی پیدائش، استعمال اور گردش کا سارا نظام ان ہی خطوط کے اندر چلے جو اس کے لئے کھینچ دیئے گئے ہیں۔
>
> (اسلام کا معاشی نظام، سلسلہ مدّ ۱۳ مارچ ۱۹۴۸ء)

اس عبارت کو دیکھنے والا خیال کرے گا کہ جس خدا نے تغیر آفریں پہلوؤں سے کوئی دلچسپی نہ لی تھی شاید وہ عالم الغیب والشہادہ ہونے کی بنا پر ہمیں کچھ ایسی قدرتی ڈگریوں سے آشنا کر رہا ہوگا جو ہماری تمام کمزوریوں کی تلافی کر سکیں۔ مگر اسے اپنا خیال واپس لے لینا چاہئے۔ کیونکہ جس خدا نے پہلی چیز پر روشنی نہیں ڈالی تھی اس نے دوسری چیز پر بھی ایک چھوٹی سی سورت یا ایک آیت تک اتارنا پسند نہ کیا۔ امید تھی کہ اس کا بہترین پیغمبر معاشی مسائل طے کرنے والی بنیادوں کو فرامینِ الٰہی کی حیثیت میں متعین کر دے گا لیکن اس نے بھی "مشلہٗ معہٗ" کے ذخیرہ میں ایسے اقوال کا اضافہ نہ کیا، جو ہماری الجھنوں کو دور کر دیتے۔

وہ تو کہئے کہ ہمارے راویوں نے اُس دور کے کچھ مختلف حالات جمع کر دیئے تھے جس سے قدرتی ڈگریوں کا پتہ چل گیا۔ ورنہ نہ قرآن کا محفوظ رہ جانا ہمیں کچھ فائدہ پہنچا سکتا تھا نہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کتاب سے ہم کوئی سبق لے سکتے تھے۔

اگرچہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے یہ شبہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جب نہ ملکیت کے مسئلہ کو قانون کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور نہ پیغمبر اسلام نے معاشی انصاف کیلئے خدا کی متعین کی ہوئی حدود کو فیصلہ کن طور پر علی الاعلان مسلم سوسائٹی میں نافذ کیا تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے طرح طرح کے حالات میں جو گوناگوں مشورے دیئے وہ ہنگامی مسائل کو حل کرنے اور عرب کی پیداواری حالات کو سنوارنے کی حد تک نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت ایک اٹل قانون کی تھی۔ لیکن ہم اس زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کی بجائے یہ مناسب خیال کرتے ہیں کہ روایات کے ذریعہ معاشی انصاف قائم کرنے کا جو بہترین حل دریافت ہو سکا ہے اس کا اندازہ کریں کہ وہ کہاں تک انسانی شعور و تجربہ کو چیلنج کرنے کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔

روایات سے کوئی بنیادی فکر پیدا کرنا چونکہ بقول مودودی صاحب کے اسلام کا مزاج شناس ہونے پر موقوف ہے۔ اور کوئی دوسرا شخص مزاج شناسی میں اُن سے بازی نہیں لے جا سکتا۔ لہٰذا ہم انہی کے ہشت گانہ حدود نقل کرتے ہیں۔

(۱) خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی (لہٰذا دولت کی بے حد و بے نہایت غیر مساوی تقسیم جو سرمایہ داری کی بنیاد اور معاشی تضاد کا سرچشمہ ہے ناقابلِ تبدیل رہے گی۔ ابوالنظر)

(۲) زمین سے استفادہ کا ہر شخص کو مساویانہ حق ہے۔ (کیونکہ زمین کی پیداواریں خدا کی نعمت نہیں ہو سکتیں ورنہ ان میں مساویانہ حقوق نہ رکھے جاتے۔ ابوالنظر)

(۳) قدرتی پیداواروں پر سب کو مساویانہ حق ہے۔ (اس لئے کوئی حکومت معدنیاتی ذخائر وغیرہ پر براہ راست اپنا قبضہ نہیں

کر سکتی کیونکہ اسے اپنی ملکیت میں رکھنے سے کسی ایسے سرمایہ دار کو محروم نہیں کیا جا سکتا جو معدنیاتی ذخائر دریافت کر چکا ہو۔ ابوالنظر)

(۴) انسانی فائدہ کی چیزوں کو بیکار ڈال رکھنا صحیح نہیں۔ (نہ معلوم خدا کے نزدیک افتادہ زمین کی طرح افتادہ رقم جسے معاشی نشوونما میں استعمال نہ کیا جا رہا ہو، ملکیت کا حق مٹا دیتی ہے یا اسے بے فائدہ جمع رکھنے کی اجازت رہے گی۔ اگر انسانی نفع بخشی ہی ملکیت کا معیار ہو گئی تو پھر کچھ اور بھی سوچنا پڑے گا۔ ابوالنظر)

(۵) قدرت کے خزانہ سے کوئی چیز لے کر جو محنت سے کارآمد بنائے وہی مالک ہے۔ (اگر کوئی قومی وحدت اس طریقہ کار کو اپنا لے تو کیا وہ تمام خزانوں کی مالک ہو سکتی ہے۔ ابوالنظر)

(۶) جائز شرعی طریقوں سے پیدا ہونے والے مالکانہ حقوق احترام کے مستحق ہیں۔ (تاکہ پچھلی جاگیرداریوں کا ظالمانہ نظام اپنی جگہ بحال رکھا جا سکے۔ ابوالنظر)

(۷) معاشی دوڑ کھلی اور بے لاگ ہونے کے ساتھ باہم دگر بے رحم نہ ہو، بلکہ ہمدرد و مددگار ہو۔ کھلی اور بے لاگ تجارتی مسابقت سے جو معاشی بحران پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جس کی وجہ سے ہمیشہ اقوام و ملل طرح طرح کی پابندیاں عائد کرنے پر مجبور ہوتی رہیں۔ کیا اس شرعی حدبندی سے اس کا حل ہو گیا۔ ابوالنظر)

(۸) اسلام فرد کو جماعت میں گم کرنا پسند نہیں کرتا تاکہ شخصی نشوونما ہو سکے۔ (اور اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں شخصی نشوونما کے بہتر سے بہتر امکانات جماعت میں گم کر دینے سے ہی پیدا ہو سکتے ہوں تو ایسی نئی صورتِ حال کی پیچیدگیوں کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہو گا؟ اور اسلام کے روشن احکامات اس سلسلہ میں کیا ہیں؟۔ ابوالنظر)

ہر تاریخی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے والے دینِ مکمل کے ترجمان کی حیثیت میں ہمارے بزرگترین مجتہد نے علماء کرام کی مفلوج تقلیدی اور قدامت پسندانہ تحقیقات کے مقابلہ پر ملکیت کے جو فیصلہ کن حدود پیش کئے ہیں اور جن کے متعلق غالباً ان کا دعویٰ بھی ہو گا کہ جو متمدن قومیں ان چند پیمانوں سے باخبر ہوں گی وہ کسی معاشی بحران، طبقاتی تضاد، تجارتی مسابقت کے نقصانات اور جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں سے نہیں گذر سکتیں ...... ان تمام پیمانوں کی مجموعی طاقت بھی ان مزدوروں تک کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔ جنہیں کسی کارخانہ دار نے بہترین سائنٹفک مشنری منگا لینے کی بنا پر اپنے کارخانے سے علیحدہ کر دیا ہو اور نہ ان کاشتکاروں کی مشکل دور کر سکتی ہے۔ جو زمیندار کی سرمایہ دارانہ طاقت سے دوزخ کا ایندھن بن چکے ہوں۔ اگر ملکیت کے چند سادہ ضابطے ترقی یافتہ تمدن کی پیچیدہ زندگی کے مسائل حل کر سکتے تو شاید انسانیت دماغی ارتقاء اور تجربات کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کر سکتی۔

پھر یہ بھی غور فرمایئے کہ جن متفرق معلومات کا نام ایسے اصول و حدود رکھا گیا ہے جن کے خطوط پر دولت کی پیدائش، استعمال اور گردش کا سارا نظام چلتا رہے گا، ان سے نہ پیدائشِ دولت کی پیچیدگیاں حل ہو سکیں، نہ استعمال کے پہلو صاف ہوئے اور نہ دولت کی گردش ہی کو وہ لائن مل سکی جس پر حرکت کرتے ہوئے ہر گردش سے معاشی نشوونما کی رفتار تیز تر ہو سکے۔ گویا کہ جس الہامی ذریعہ علم سے ہم نے رہنمائی کی توقع کی تھی۔ انسانی شعور و تجربہ کو ناکام یقین کر کے، وہ بھی اپنی کامیابی کا یقین نہ دلا سکا۔

آپ کو یہ بدگمانی ہو سکتی ہے کہ ہم نے ان حدود کو رہنمائی کے ناقابل بتلانے میں کسی عداوت سے کام لیا ہو۔ اس لئے اسلامی جماعت کے مزاج شناس مفکرین ہی کے کچھ خیالات پیش کرنے کی اجازت دیجئے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ان حدود سے خود ان کا تصور بھی کچھ

روشنی حاصل کر سکا۔ یا وہ بھی "مارکسی مومنین" کی طرح بھٹکتے اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔

مولانا نعیم صدیقی صاحب جو علامہ مودودی کے دائیں بازو ہیں، مسئلہ ملکیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

(۱) انسان، احتیاجات کے لئے ملکیت چاہتا ہے۔

(۲) انسانی ملکیت کے حق کا قائم ہونا اور قائم رہنا اس بات پر بھی منحصر ہے کہ انسانی معاشرہ اس حق کو تسلیم کرنے اور اس کی حفاظت کرنے پر تیار ہو۔ اس لحاظ سے انسانی ملکیت کا معاملہ سیاسی و اخلاقی نوعیت کا ہے۔ تکوینی نوعیت کا نہیں۔

(۳) انسان اپنے حقوق ملکیت اور املاک کے استعمال کے لئے از روئے حق، ضابطہ سازی کا مجاز نہیں ہے۔

(انفرادی ملکیت اسلام میں۔ ترجمان القرآن۔ جلد ۳۴ عدد ۶ صفحہ ۳۳۴)

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جن حدود اور پیمانوں کو معاشی انصاف قائم کرنے کیلئے ضروری قرار دیا گیا تھا۔ کیا صدیقی صاحب نے اُن سے کوئی روشنی حاصل کی۔ یا اپنے نئے ایجاد کردہ حدود سے نیا معیار قائم کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ حدود سازی کی یہ مہم کہاں تک چل سکتی ہے۔ اور خود حدود کے حسن و قبح کو متعین کرنے کے لئے کونسی کسوٹی کام میں لائی جائیگی۔ اس کے بعد نعیم صاحب کے فلسفہ کی روشنی میں غور کرنا ہوگا کہ اگر مسئلہ ملکیت لوگوں کی حاجت مندی نے پیدا کیا تھا تو پھر اس نظامِ حکومت کا انفرادی ملکیت کو ختم کر دینا کیونکر غیر منطقی کہا جا سکتا ہے جو عوامی احتیاج کو مٹا دینے اور سب کو قدرتی پیداواروں سے مساویانہ فائدہ اٹھانے کا موقعہ دینا اپنا اولین فرض قرار دیتا ہو۔ اگر عوام کی احتیاج واقعی کسی معاشی نظام سے دور کی جا سکتی ہو تو صدیقی صاحب کو کیا حق ہے کہ اس معاشی نظام کو کافرانہ غلط اور حدود کے خلاف قرار دیں۔ خصوصاً جبکہ خود ان کے نزدیک بھی مسئلہ ملکیت، تکوینی قسم کا نہیں جسے تبدیل نہ کیا جا سکتا ہو، بلکہ سیاسی اور اخلاقی نوعیت کا ہے جسے سیاسی تغیرات اور سوسائٹی کے عام احساسات بدل جانے پر تبدیل کر دینا چاہئے کیونکہ ملکیت جیسے حقوق و مسائل انسانی معاشرہ کے تسلیم کرنے اور حفاظت کی ذمہ داری لینے پر موقوف رہتے ہیں۔ اگر کسی تمدنی انقلاب سے اثر پذیر ہو کر سوسائٹی حقوق ملکیت تسلیم کرنے یا ان کی حفاظت کرنے سے انکار کر دے تو ملکیت کی ساری عمارت ڈھیر ہو جائے گی۔ حالانکہ مودودی صاحب کے نزدیک خدا کی خوشنودی کیلئے انفرادی ملکیت کا نظام قائم رکھنا ضروری تھا۔ اگر خدا کی مرضی، عوام کی خوشنودی و خوش حالی تھی، تب تو نعیم صاحب کا تصور غلط نہیں۔ اور اگر عوامی سود و بہبود سے بے نیاز ہو کر ملکیت جیسے پیداواری ضابطہ کو ناقابل تبدیل بنا دینا، خدا کے نزدیک ضروری ہو تو علامہ مودودی کا قیاس درست رہے گا۔ مگر آپ کو شاید یہ دیکھ کر تعجب ہو کہ وہی نعیم صاحب جو ملکیت کو سیاسی اور عام اخلاقی مسئلہ قرار دے رہے تھے اور سوسائٹی کی رضامندی پر گردش کرنے والی چیز۔ دوسرے موقعہ پر فرما رہے ہیں کہ "انسان، حقوق ملکیت اور املاک استعمال کرنے کیلئے از روئے حق ضابطہ سازی کا حق نہیں رکھتا"۔ ایک طرف انسانیت کو ملکیت قائم رکھنے یا نہ رکھنے تک کا حق دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اسی ملکیت کے تفصیلی حقوق طے کرنے کے لئے آئین سازی کا حق نہیں دیا جا رہا۔ دراصل جب ذہن الجھا ہوا ہو تو ہمیشہ ایسی ہی تاریکیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ نعیم صاحب کی طرح خود مودودی صاحب بھی الجھے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک طرف وہ کسی حال میں انفرادی ملکیت کا دباؤ کم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور دوسری طرف بعض صنعتوں کو قومی ملکیت میں دینے کیلئے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ قومی ملکیت کا حق نہ معلوم کونسی آیت و حدیث سے پیدا کیا گیا۔ اور وہ بھی فرمانِ الٰہی جانے کس طرح کا تھا کہ جس صنعت کو مودودی صاحب قومی ملکیت بنانا پسند کرتے ہوں۔ اسے قومی ملکیت بنانے کی اجازت دیدے اور جسے وہ اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر قومی ملکیت کے دائرہ میں داخل

کرنا نہ چاہتے ہوں اُسے حرام قرار دیدے۔ حالانکہ وہ خود فرما چکے ہیں کہ

اسلام جن جن کران تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے جن سے ایک شخص دوسرے اشخاص کو یا بہ حیثیت مجموعی پوری سوسائٹی کو اخلاقی یا مادی نقصان پہنچا کر اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ (اسلام کا نظام حیات ص۵)

اگر اسلام کا بنیادی زاویۂ نگاہ یہی تھا جس کی ترجمانی مذکورہ فقروں میں کی گئی ہے تو کیوں اسی کسوٹی پر زمینداری، جاگیرداری، سرمایہ داری اور اشتراکی نظام کو نہیں پرکھا جاتا۔ انفرادی ملکیت ہو یا قومی ملکیت جو بھی سوسائٹی کو اخلاقی اور مادی نقصان پہنچائے اسی کو حرام قرار دیدینا چاہیئے۔ اگر تحریر و تقریر کی بے حد و نہایت آزادی بغیر حاجت مندی کے وسائل رزق تلاش کرنے کی آزادی اور اجتماعی زندگی پر غلط یا صحیح اثر ڈالنے والے ہر طرز فکر کی آزادی جیسی چیزوں پر پابندی مولانائے محترم کے نزدیک انسانیت کا اخلاقی نقصان ہے۔ تو کیا مالکانہ حقوق کی وہ آزادی جو انسانوں کو جانوروں سے بدتر پوزیشن میں لے آئے، انسانیت کا سب سے بڑا اخلاقی اور مادی نقصان نہیں قرار دی جاسکتی۔ اور کیا شرعی حدود کی ہر دوسرے عالم سے زیادہ بصیرت رکھنے کا ثبوت دے سکنے کے شوق کو کچھ دنوں کے لئے چھوڑ کر انسانیت کے اخلاقی، ذہنی اور مادی نقصانات ہی کے پیش نظر ہر نظام ملکیت پر تنقید کرنا موزوں ترین راستہ نہ ہوگا۔

کہنے کو تو علامہ مودودی صاحب نے کہدیا کہ

اسلامی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ اپنی دولت میں ناروا تصرفات کرنے سے لوگوں کو روک دے۔ (اسلام کا نظام حیات ص۵)

لیکن یہ نہ بتایا کہ مذکورہ قانونی دفعہ کونسی آیت و حدیث سے نکالی گئی ہے اور نہ یہ بتایا گیا کہ اس "ناروا" کی تعریف کیا ہوگی جس کو روک دینے کا حق حکومت کو دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وہ آیات جو صاف طور پر نیکی و بدی اور خیر و شر کو متعین کر رہی ہیں۔ اسلامی جماعت کے مفکرین انھیں بھی آئینی صداقت محسوس نہیں کرتے۔ قرآن نے کہا تھا کہ

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ۔

تم نیک خیالی اور نیک عملی کو نہیں اپنا سکتے جب تک اس ساز و سامان کو تقسیم نہ کرو جس سے طبعی طور پر کشش محسوس کرتے ہو۔

والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها۔ (الی آخرہ)

وہ لوگ جو سونے، چاندی کو صرف جمع ہی کرتے رہتے ہیں اور نفیٔ زر نہیں کرتے۔

یعنی اگر صحابۂ کرام نیکی اور بھلائی اپنانا چاہتے ہیں وہ نیکی جس کا تصور قرآن حسب ذیل الفاظ میں متعین کر چکا۔

لیس البران تولوا وجوهکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن بالله والیوم الآخر والملئکة والکتاب والنبیین وآتی المال علی حبه۔ الی آخرہ

اس چیز کا نام نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو پورب یا پچھم کی طرف کرکے پرستش کرو بلکہ نیکی نام ہے اس چیز کا کہ ایک شخص خدا، غیر متوقع انقلاب، فرشتوں، الہامی دستور، اور پیغمبروں پر یقین کرتے ہوئے انسانی محبت کی بنیاد پر سرمایہ تقسیم کرے۔ وغیرہ

اور جس کے سرسری مطالعہ سے بھی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک نیک خیالی اور نیک عملی اس مخصوص تصور کا نام ہے جو ان الابرار لفی نعیم (یقیناً نیک لوگ عیش میں ہیں) کے نتیجہ تک پہنچا سکتا ہو۔ اور یہی وہ نیکی ہے جس کی خواہش رکھنے والوں سے قرآن کہتا ہے کہ تم اس وقت تک نیک کہلائے ہی نہیں جاسکتے جب تک اپنے دل پسند سرمایہ کو صرف کرنے سے گریز کرتے رہو گے۔ اور جب نیک نہیں

کہلائے جاسکتے تو صاف ظاہر ہے کہ نیک عملی کے نتیجہ میں عیش و بہار کی زندگی تک بھی رسائی نہ ہوسکے گی۔ گویا کہ تقسیمِ دولت نہ کرنے والا خدا کے نزدیک نہ عقائد کے لحاظ سے نیک خیال ہے، نہ عمل کے لحاظ سے، نہ نیک عملی کے بہترین نتائج کی اُسے کوئی توقع رکھنا چاہئے مگر ہمارے نعیم صاحب صدیقی اس آیت کے تحت تقسیمِ زر کو

> رضاءِ الٰہی کیلئے قانونی حقوق سے آگے بڑھ کر جتنی زیادہ سے زیادہ قربانیاں دیسکتا ہو دے۔ (ترجمان القرآن ۳۳ء ۲۲ ج ۶)

رضاءِ الٰہی کی تمنا رکھنے والے پاک باطن اولیا کا ضابطہ کار قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی مفاد پرستی کے زیرِ اثر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا تو آپ کا قانونِ اسلام کوئی گرفت نہیں کرے گا۔ اگر اتنی اہم ترین "ناروا حرکت" پر بھی قانونی گرفت نہیں ہوسکتی۔ اور اس ساہوکار کو بھی آئینی شکنجہ میں نہیں کسا جاسکتا جس کے خلاف خدا نے کھلم کھلا اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے سخت ترین عذاب کا چیلنج دیدیا ہو تو خدا کیلئے بتائیے کہ آخر وہ کونسی "ناروا کارروائی" ہوسکتی ہے جس کو خدا نے آئینی گرفت میں رکھنا پسند کیا ہو۔ جہاں تک قرآن کی تعزیرات کا تعلق ہے چوری اور زنا کے سوا کوئی جرم بھی تعزیری جرم نہیں۔ اور اگر قرآن کے بنیادی نصب العین کو نافذ کرنے کیلئے تعزیری دفعات میں اضافہ کیا جاسکتا ہے تو خدا نے جن معاشی پہلوؤں پر سب سے زیادہ زور دیا جنھیں تباہ کن بتایا اور جو اس کے نزدیک خدا کے قہر و عذاب سے کسی طرح بھی بچ کر نہیں جاسکتے۔ انھیں آئینی گرفت میں نہ لینے کی کیا وجہ؟ جس سرمایہ میں "سائل و محروم" کا حق مقرر کردیا گیا ہو، اس طے شدہ حق کو آئینی طاقت سے آزاد بتاتے ہوئے سرمایہ دار کے حقِ ملکیت کو محفوظ کرانے پر تمام طاقت صرف کرانے والے معلوم نہیں کہ اسلام کے نظام کو ظالمانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے طعنہ سے کیونکر بچاسکیں گے۔

اگر خدا کے بنیادی نصب العین کو مٹانے والی حرکات بھی "ناروا" نہیں ہیں اور انھیں حکومت آئین سازیوں سے درست کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ تو پھر وہ کونسی ناروا حرکات ہیں جنھیں حکومت روک دینے کا حق رکھتی ہے اور ان ناروا حرکات پر گرفت کا حق، اسلام کے کون سے فلسفۂ حیات کی سفارش پر دیا جاسکتا ہے۔ عوام کی سوسائٹی میں جن چند حرکات کو غیر اخلاقی قرار دیا جاتا ہے۔ کیا ہمارے نئے مجتہدین کے نزدیک صرف انہی پر گرفت کرنا کافی ہے۔ شاید اس سیاسی تدبیر سے کچھ جاہل عوام مطمئن ہوسکتے ہوں۔ لیکن اسلام کے نظامِ حیات کو وہ وقار نصیب نہیں ہوسکتا جو انسانی شعور و تجربہ کو سجدہ کراسکے۔

یہ تھا اس مجتہدانہ فکر کا ایک ظلمت بدوش منظر جسے قدیم طرزِ فکر رکھنے والے علماء دین کے مقابلہ پر نئے مسائل حل کرنے کا حق سپرد کیا جارہا ہے اور یہی تھا اس اجتہادی ذہانت کا نمونہ جس کے بھروسہ پر مولانا نعیم صاحب صدیقی یہ کہتے ہوئے تمام دوسرے علمائے رہنمائی کا حق چھین کر اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے ہیں۔

> یہ صحیح ہے کہ رائج الوقت نظام کو بدل کر کسی دوسرے نقشہ پر زندگی کی تعمیر کرنا ہر عمرو زید کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جن میں دو شرطیں پائی جاتی ہوں۔ ایک یہ کہ وہ فی الحقیقت پرانے نظام سے منحرف ہوچکے ہوں اور سچے دل سے اس تجویز پر ایمان رکھتے ہوں جس کے مطابق نظامِ زندگی میں تغیر کرنا پیشِ نظر ہے دوسرے یہ کہ ان میں تقلیدی ذہانت کے بجائے اجتہادی ذہانت پائی جاتی ہو۔ وہ محض اس درجہ کی ذہانت کے مالک نہ ہوں۔ جو پرانے نظام کو اس کے اماموں کی طرح چلائے جانے کیلئے کافی ہوتی ہے۔ بلکہ اس درجہ کی ذہانت رکھتے ہوں جو پامال راہوں کو چھوڑ کر نئی راہ بنانے کیلئے درکار ہوتی ہے۔ یہ دو شرطیں جن لوگوں میں پائی جاتی ہوں وہ کمیونزم اور نازی ازم اور فاشزم جیسے سخت انقلابی

مسلکوں کی تجاویز تک عمل میں لا سکتے ہوں اور ان شرطوں کا جن میں فقدان ہو، وہ اسلام کے تجویز کئے ہوئے انتہائی معتدل تغیرات کو بھی نافذ نہیں کر سکتے۔ (ترجمان القرآن ص۱۷۳ جولائی تا ستمبر ۱۹۵۰ء)

ہمارے زمانہ کے یہ مجتہدین جو امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام حنبلؒ وغیرہ کی فقہ سے استفادہ کرتے ہوئے پامال راہوں پر نہیں چلنا چاہتے اور جو پرانے نظام سے منحرف ہو کر نئی تجاویز کی روشنی میں نظامِ زندگی کو بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے زندگی کے کسی ایک گوشہ قرآنی آیت کی کسی تفسیر اور پرانے نظام فکر و عمل کے کسی پہلو میں بھی ذرہ برابر اجتہادی ذہانت کا ثبوت نہ دیتے ہوئے ان مفکرین اسلام کو "مارکسی مومنین" کا طعنہ دینا پسند کرتے ہیں جو اُن کے فرسودہ خیالات سے ذرہ برابر بھی اختلاف کرنے کی جرأت کر رہے ہوں۔ حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی وغیرہ جیسے سنجیدہ لوگوں نے "مودودی فرقہ" کے تصورات سے ہٹ کر قرآن کی بعض آیات سے کچھ نئے پہلو نکالے تھے اس گناہ میں انھیں مسلمانوں کی صف سے ہی نکال دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خیر یوں ہی سہی۔ مگر ہمیں اس بات کی ضرور خوشی ہے کہ ہمارے نئے رہنماؤں کو قرآن کے زاویۂ نگاہ پر سوچنے کی فرصت نصیب ہو سکی، یہ بھی ایک نیک فال ہے۔ آج نہ سہی تو کچھ دنوں کے بعد یہ شاہراہ خود بخود صراط مستقیم پر لے آئے گی۔

چونکہ ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی جماعت کے مفکرین اس راہ پر قائم رہیں۔ لہٰذا ہم ان کی قرآن فہمی پر بحث و گفتگو کر کے انھیں مزید نکتہ چینی کا موقعہ دینا چاہتے ہیں۔ کاش ہماری آرزو پوری ہو۔ اور جس قرآن کو "رومنی مومنین" اور "مارکسی مومنین" کیلئے معیارِ حق و باطل بنا دیا گیا ہے اسے ہی آخری فیصلہ کا حق بھی دیا جائے۔ تاکہ مسلمان بھی اس بلندی تک پہنچ سکیں جس پر کھڑے ہو کر حضرت عمرؓ نے اعلان کیا تھا:

حسبنا کتاب اللہ

ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔

نعیم صدیقی صاحب نے مودودی مفکرین کی قرآن فہمی پر ناز کرتے ہوئے حکیم حیدر زماں صاحب جیسے "معمولی دماغ" رکھنے والے ناآشنایانِ دین کو نشانۂ ملامت بنانے کیلئے چند آیات کے سیاق و سباق سے اپنے زاویۂ نگاہ کو ثابت کرنے اور "مارکسی مومنین" یا بالفاظ دیگر "منافقین اسلام" کو جاہل بددیانت اور انتہائی بداخلاق بتانے کی جرأت کی ہے۔ محض اس قصور میں کہ

یہ حرکت کہ کسی کے کلام میں سے ایک فقرہ نکال کر اس کو من مانے معنی پہنائے جائیں انتہائی بداخلاقی میں شمار ہوتی ہے جسے لوگ بددیانتی کہتے ہیں ۔۔۔ ان کا گمان یہ ہے کہ شاید قرآن سے ساری دنیا ان ہی کی طرح جاہل واقع ہوئی ہے۔

(ترجمان القرآن ص۳۲ نومبر ۱۹۵۰ء)

کیا ان "دانایانِ رموز" کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ آج تک فقہاء اسلام نے جس قدر احکام القرآن پیش کئے تھے ان کا بڑا حصہ "اشارۃ النص" اور سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر ہی آیاتِ الٰہی سے پیدا کیا گیا تھا۔ جصاص کی احکام القرآن نہ سہی، نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تفسیر روح البیان ہی دیکھ لیجئے۔ تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ جیسی چھوٹی آیات سے گیارہ گیارہ احکام نکالے گئے ہیں اور اس خوبی سے کہ استخراجِ احکام کے بارے میں کوئی شبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ اور کیا انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ احادیثِ پیغمبرؐ کی "کتاب التفسیر" بھی سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر ہی قرآن کے معانی متعین کرتی رہی۔ اپنے زاویۂ نگاہ سے اختلاف رکھنے والوں کو معمولی باتوں پر اتنا برا بھلا کہنے سے ان لوگوں کو شرم آنا چاہئے جو دنیا کو ایک نئے سیاسی فتنہ سے دوچار کرنے کیلئے اخلاقی انقلاب کا ڈھونگ

رچا رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے طبقہ کے علما اور مفکرین کو بھی دشنام طرازی کا نشانہ بنا رہے ہوں ان سے دوسرے لوگوں کو شرافت کی توقع رکھنا فضول ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کی فن کاریوں نے آپ کو کسی نہ کسی حد تک سیاسی اثر و نفوذ کا موقعہ دیدیا ہے مگر ایسے ہنگامی طوفانوں میں ہوش و حواس ضرور قائم رکھنے چاہئیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ کبھی "اترا شحنہ، مردک نام" کے طعنوں سے بھی گذرنا پڑے، قرآن سے احکام نکالنے کے مختلف طریقے ہیں اور ان سب سے احکام نکالنے کا حق رہے گا۔ ہاں اگر اشارۃ النص اور عبارت النص وغیرہ سے جو احکام نکل رہے ہوں ان میں تضاد پیدا ہو جائے تو ضرور ہمیں کھلی ہوئی سچائیوں ہی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ ورنہ قرآن کا ہر اشارہ قابلِ تسلیم رہے گا۔

علاوہ ازیں یہ خیال کر لینا کہ سیاق و سباق سے معنی متعین کر لینا کوئی اتنا معمولی کام ہے کہ اسلامی جماعت کا ہر کلرک اس کے ذریعہ قرآن کی نازک علمی سچائیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بھی دھوکہ ہے اور کھلا ہوا دھوکہ۔ اگر آپ اس پہلو کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو ان دو آیتوں کے سیاق و سباق پر صدیقی صاحب اور ہمارے زاویۂ نگاہ سے بحث کرنے کی اجازت دیجئے جنہیں صدیقی صاحب نے جارحانہ حملہ کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔

کیا محنت، ملکیت کا حق سپرد کر سکتی ہے

اسلامی جماعت کے مفکرین اور حکیم حیدر زماں صدیقی، دونوں کے دونوں اس چیز پر تو اتفاق رکھتے ہیں کہ محنت بھی حقوقِ ملکیت قائم کر سکتی ہے۔ صرف اختلاف اس چیز میں ہے کہ کیا سرمایہ محنت سے پیدا ہونے والی ملکیت پر قبضہ کر کے، اس ملکیت کی منفعت بخشی پر قبضہ کر سکتا اور محنت پیشہ کو عیش و آرام کی زندگی تک پہنچنے سے روک سکتا ہے یا نہیں۔ بات بہت سادہ تھی اور ہر زندہ احساس رکھنے والا انسان اسے آسانی سمجھ سکتا تھا۔ مگر اشتراکی دماغ نے فلسفہ کے سہارے اور حیدر زماں صاحب نے قرآنی آیت سے یہ ثابت کیا کہ ملکیت کا حق محنت کرنے والے ہی کو ہو سکتا ہے، محنت کے نتائج کو اپنے لئے مخصوص کرنے کا سرمایہ دار کو کوئی حق نہیں۔ اشتراکیت نے نعیم صاحب صدیقی کے الفاظ میں حسب ذیل بنیاد پر نیا معاشی نظام بنایا تھا۔

> مارکسی فلسفہ نے سرمایہ کو محنت کاروں کی صرف کردہ سابق محنت کا جمع شدہ جوہر ثابت کیا اور دعویٰ یہ کیا کہ خود سرمایہ بھی محنت کی بدلی ہوئی شکل ہے اور اس پر بھی حقوق محنت کاروں ہی کے قائم ہونے چاہئیں۔ (ترجمان القرآن ص۳۹۔ نومبر ۱۹۵۰ء)

چونکہ اس فلسفہ کے جواب میں دوسرا فلسفہ پیش کر سکنا، اسلامی جماعت والوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ اور اسی لئے ان کا تمام لٹریچر اشتراکی فلسفہ کے مقابل دوسرا فلسفہ پیش کرنے سے قاصر رہا۔ بنا بریں انہوں نے انسانی شعور سے شکست قبول کر کے قرآن سے نکتہ آفرینی کرنے والوں کو زد پر رکھ لیا۔ حالانکہ اسلامی جماعت کے یہ مجتہدین کرام جو اسلام اور قرآن کے مزاج شناس ہونے کے مدعی ہیں۔ خود بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ محنت و سرمایہ کے تضاد کو مٹانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ نعیم صاحب محنت و تصرف کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

> لیکن اگر جنسِ خام پر ابتدائی قبضہ دوسرے نے کیا یا اس پر محنت کئی آدمیوں نے مشترک طور پر صرف کی، یا پہلے ایک اسٹیج پر کسی محنت کار نے اولیں محنت کر کے حقوقِ مالکانہ حاصل کرنے کے بعد دوسرے اسٹیج کی محنت کے لئے اسے دوسری محنت کے سپرد کیا، یا ایک شئے خام اپنی تکمیل کیلئے صرف محنت ہی کی نہیں سرمایہ کی بھی مقتضی تھی اور سرمایہ صرف کر کے کسی نے اس پر مالکانہ حقوق پہلے حاصل کر لئے تو ان ساری صورتوں میں ایک شخص کی محنت اسے حقوقِ مالکانہ دلوا دے گی۔ اس قسم کے حالات میں دراصل ایک محنت کار اپنی محنت کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر کے نقد معاوضہ لے لیتا ہے یا سرمایہ و محنت کے نتائج میں کسی تناسب سے حصہ داری کر لیتا ہے۔ بہر حال محنت و تصرف حقوقِ مالکانہ کے حاصل کرنے کا ایک بڑا راستہ ہے لیکن صرف

یہی ایک راستہ نہیں۔ (ترجمان القرآن ماہ نومبر ۱۹۵۰ء)

مولانائے محترم اس حد تک تو تسلیم کرتے ہیں کہ محنت، حقوق مالکانہ کا سب سے بڑا راستہ ہے، لیکن یہ نہیں فرماتے کہ اس شاہراہ کی کشادگی اور عظمت و بلندی، سرمایہ کی تنگ راہ کے مقابلہ میں کس حد تک فوقیت رکھتی ہے اور اس بنیاد پر محنت کون سے ایسے حقوق حاصل کرنے کے قابل ہے جنھیں سرمایہ کا تنگ یا چھوٹا راستہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر محنت اپنی تمام خوبیوں اور بزرگیوں کے باوجود حقوقِ مالکانہ نہیں دلا سکتی تو کیا تنہا سرمایہ کو یہ حق ہے کہ وہ محنت کی تخلیق پر مالکانہ حقوق حاصل کر لے۔ اگر کسی صنعت کی تکمیل کے لئے طرح طرح کے فن کاروں کی ضرورت ہوتی ہے اور انھیں اپنی گوناگوں محنتوں سے مشترکہ طور پر ہی نفع اٹھانے کا حق دیا جا سکتا ہے تو کیا محنت کو مالکانہ حقوق میں شریک کئے بغیر سرمایہ دار بے حساب منافع پانے کا حق دار ہو سکتا ہے۔ کیا کارخانہ داری سسٹم میں محنت و سرمایہ کم از کم برابری کے شریک ہو سکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ آپ ہماری نادانی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک فریب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور وہ

"سرمایہ و محنت نے نتائج میں کسی تناسب سے حصہ داری کرنا ہے"۔

گویا کہ آپ ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ کسی کارخانہ میں جو مزدور، اپنے افلاس سے مجبور ہو کر روپیہ دو روپیہ روز کی مزدوری لے لیتا ہے وہ سرمایہ و محنت کے نتائج میں "حصہ داری" کے معنی رکھتا ہے۔ "کسی تناسب" کے فقرہ میں آپ نے جس خوبی سے سرمایہ دار کی نفع اندوزی اور مزدور کے خون و پسینہ کی بے قیمتی کو چھپایا ہے۔ اس کی ادبی نقطۂ نظر سے داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ مگر آپ یہ نہ بھول جائیے کہ جس خدا کو آپ حاضر و ناظر کہتے رہتے ہیں وہ درحقیقت حاضر و ناظر ہی ہے۔ ادبی داؤ پیچ سے خدا کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ مجبورانہ ماحول کی بدترین پوزیشن میں ہوتے ہوئے مزدور کا چند خزف ریزوں پر راضی ہو جانا "کسی تناسب" سے بھی شرکت نہیں کہلایا جا سکتا۔ اگر مزدور کو آزادانہ طور پر فیصلہ کرنے کا اختیار رہتا تو آپ پہلے منٹ میں اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ اس تناسب کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پچھلے دور میں چونکہ مشینی طاقت کا رواج نہ ہوا تھا اس لئے نہ سرمایہ دار بے حساب رزق حاصل کر سکتا تھا، نہ مشینی آلات مزدوروں سے بے پرواہ بنا سکتے تھے۔ آج صورتِ حال بدل گئی۔ اور اس لئے بلند و پست زندگی کا نشیب و فراز بھی نمایاں تر ہو کر باہمی نفرت کی دوزخ کو تیز تر کرتا جا رہا ہے۔ "رکھشا" چلانے والے کا کسی وقت آٹھ آنے اور کسی وقت دس آنے لے لینا تو روزمرہ کی زندگی میں ایک طرح کا "تناسب" کہلایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ معاشرتی زندگی میں کوئی تضاد ابھر سکتا ہے نہ نفرت پھیل سکتی ہے۔ لیکن اس مزدور کا جو ماضی سے شرمندہ، حال سے مایوس اور مستقبل سے خوف زدہ ہو۔ گردشِ روزگار سے بے پرواہ ہو جانے والے کروڑپتی کے کارخانہ میں دن گذار سکنے کے لئے ملازمت پر راضی ہو جانا محنت و سرمایہ کی باہمی مفاہمت، شرکت اور اقتصادی توازن نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کچھ مزدوری لے لینے کی وجہ سے "حصہ دار" بتانا اتنا بڑا فریب ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دراصل آج سرمایہ و محنت کی جو کشمکش ہو رہی ہے اُسے اسلامی جماعت کے مفکرین یا تو سمجھ ہی نہ سکے یا اپنی امتیازی حیثیت قائم کرنے کیلئے انھیں ذہنی مغالطے دینے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ ورنہ کسی طرح بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عربی اقتدار کے زیر اثر گزرنے والی صدیوں کو اہلِ بدعت کی بداعمالیوں سے معمور بتانے والے انھیں کے قوانینِ ملکیت، انھیں کے زراعتی نظام اور انھی کے اقتصادی سسٹم کو اسلام کا ابدی قانون" نہ لگیں گے۔ مفکر اُسے نہیں کہتے جو خیالات کی ہر وادی میں گل گشت کرتا رہتا ہو۔ یہ تو

شاعری ہوئی۔ اگر مجتہد اور مفکرِ اسلام کہلانے کو جی چاہتا ہے تو یہ راہ چھوڑ دیجئے جو تقلید کی تاریکیوں سے بھی زیادہ بھیانک تاریکیوں کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس سے تو وہی پرانے علماء اچھے ہیں جو فقہاءِ اسلام کی آئین سازیوں ہی کو اپنے لئے کافی سمجھ کر اپنے ضمیر کی آواز پر چل رہے ہیں۔ آپ اپنے شرحِ صدر سے دھوکہ کھا کر علماءِ دین کو اپنے آپ سے کمتر محسوس نہ فرمائیے۔ شرحِ صدر ایمان ہی کا نہیں ہوتا۔ کفر بھی شرحِ صدر رکھتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا شرحِ صدر کسی ایسے غلط راستے پر ڈال دے جہاں سے آپ واپس ہی نہ ہو سکیں۔

یہ ہے وہ نظریۂ ملکیت جس تک اسلامی جماعت کے مفکرین پہنچ سکے۔ مگر پھر بھی دوسرے اہلِ قلم پر اس طرح حرف گیری کر رہے ہیں گویا کہ انسانی شعور اور قرآن کا علم اسی جماعت کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔

آئیے اس چیز کا بھی اندازہ کریں کہ قرآن کا علم رکھنے والوں نے بددیانت جاہلوں کی اُن آیات کو کس حد تک سمجھا ہے جنھیں ملکیت کا مسئلہ حل کرنے کیلئے پیش کیا گیا تھا۔ نعیم صاحب صدیقی ارشاد فرماتے ہیں:۔

> قرآن سے ایک برہان قاطع لیس للانسان الا ما سعٰی سے اخذ کرتے ہیں۔ حالانکہ اسکو اگر سیاق و سباق سے الگ کر کے موضوعِ معاد کی بجائے موضوعِ معاش سے وابستہ کرنا جائز ہو تو ——— لیس للانسان الا ما سعٰی کا اصل مفہوم سمجھنے کیلئے یہ کافی نہیں ہے کہ محض ایک ٹکڑے کو اصل کلام سے الگ کر کے اس کا کوئی ترجمہ کر لیا جائے۔ بلکہ اس کو اصل بیان میں دیکھا جائیگا ہمیں یقین ہے کہ ان الفاظ سے فلسفۂ ملکیت تعمیر کرنے والوں نے کبھی ایک مرتبہ بھی سورۂ النجم کو ترجمہ کے ساتھ پڑھا بھی نہ ہوگا۔ ان سے پوچھ دیکھئے کہ اس سورۃ النجم کا نفسِ مضمون کیا ہے اور اس کا عمود کلام کیا ہے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

ہم نے پچھلے دو درس فُرقِ اسلامیہ کے باہمی مناظروں میں یہ انداز بیان دیکھا تھا۔ اس کے بعد اب اتفاق ہوا ہے۔ مجمع کو پُر فریب الفاظ میں اپنی قابلیت سے مرعوب کر دینا ایک فن تھا جس کے استاد مٹتے جا رہے تھے۔ ہمیں خوشی ہے کہ پچھلے زمانہ کی یہ یادگار ابھی کچھ دنوں اور بھی زندہ رہ سکے گی۔ مولانا صدیقی صاحب کے مخاطب بھی اگرچہ دین و مذہب سے واقفیت رکھنے والے اور ان ہی کی طرح نظامِ اسلام پر ریسرچ کرنے والے ہیں لیکن مولانائے محترم کے اندازِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ فاضل مخاطب، با ترجمہ قرآن پڑھنے والوں میں بھی معلوم نہیں ہوتا اور خود مولانا کے متعلق یہ خیال جاتا ہے کہ انھوں نے قرآن کی ساری گہرائیوں اور بلندیوں کو پوری طرح ناپ لیا ہے۔ وہ عمود کلام بھی جانتے ہیں اور نفسِ مضمون بھی۔ حالانکہ "عمودِ کلام" کا تصور، مولانا نے اُن علامہ حمید الدین فراہیؒ سے سرقہ کیا تھا جو مجتہد نہ ہوتے ہوئے بھی ایسی تفسیر ورثہ میں چھوڑ گئے ہیں کہ ترجمان القرآن والے سالہا سال تک اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں گے چونکہ ان کی عربی تفسیر عام نہیں ہوئی اس لئے شاید مولانا کو یقین ہوگا کہ دوسرے لوگ اس کا مطالعہ نہیں کر سکے ہوں گے اور یوں مجھے رعب جانے کا موقعہ مل جائے گا۔ اگر یہی فرض کر لیا جائے کہ مولانا کا سوءِ ظن "ساقیانِ علم و خرد" کے لئے درست ہے تب بھی انھوں نے یہ کیسے خیال فرما لیا کہ جس تصور کو کسی مفکر نے بنیادی تصور اور عمودِ کلام بتا دیا تھا اسے وحی و الہام کی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد، سوارے باشد

بہر حال مولانائے محترم نے اپنی قرآن فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذکورہ آیت کا طویل پس منظر اور پیش نظر نقل فرمایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس تمام ٹکڑے کو نقل کر دیا جائے تاکہ بقول مولانا کے "بددیانتی اور انتہائی بداخلاقی" سے ہمارا دامن پاک رہ سکے۔

ملاحظہ فرمائیے۔

۱؎ سورۂ النجم کا سلسلۂ مطالب یوں چلتا ہے کہ

(۱) نبی صلعم کا سر نہیں پھر گیا، وہ من گھڑت باتیں نہیں کہتے بلکہ ان کی ہر بات وحی کے مطابق ہوتی ہے۔

(۲) یہ وحی ایک قوی وامین فرشتے کے ذریعہ آتی ہے۔

(۳) نبی صلعم کو اپنے آقا سے قرب حقیقی حاصل ہو چکا ہے اور اس نے جو کچھ چاہا وہ کچھ آپ پر براہ راست وحی کیا ہے۔

(۴) نبی صلعم نے ایک کیفیت چشم بصیرت سے دیکھی ہے اور ان کے دل نے اس کی تکذیب نہیں کی بلکہ اسے قبول کیا ہے۔

(۵) اب تم اے کفار مکہ نبی صلعم سے ایسے معاملہ میں جھگڑتے ہو جسے آپ نے خود دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

(۶) خود اپنے گریبان میں منہ ڈالو کہ تم لات ومنات اور عزیٰ کو آلہ بنائے ہوئے ہو اور ان کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہو، حالانکہ اس کے لئے نہ تم پر وحی کی گئی، نہ تم کو اللہ کی حقیقتوں کا چشم بصیرت سے مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا ـــــ یہ تم نے خود ہی نام گھڑ لئے ہیں جن کیلئے کوئی دلیل نہیں۔

(۷) تم محض ظن وقیاس پر جان دے رہے ہو۔

(۸) کیا انسان کو وہی کچھ مل جاتا ہے جس کی اپنے قیاسات کے پیش نظر وہ ہوس کرنے لگے۔

(۹) حالانکہ دنیا وآخرت کا سارا معاملہ اللہ کے اپنے بس میں ہے اور اس کے سامنے اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش نہیں چلتی۔

۲؎ یہ ہے سلسلۂ کلام جس میں نبی صلعم کی نبوت اور حقیقت وحی پر گفتگو شروع ہوتی ہے اور خطاب کفار ومشرکین سے ہے اور ان کی بت پرستی اور مشرکانہ عقائد کا تذکرہ ہے جس کی رو میں وہ نبی صلعم کو جھٹلاتے ہیں۔ اور اسی سلسلۂ کلام کے تحت بات یہاں پہنچتی ہے کہ لیجزی الذین اساؤا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنیٰ۔ یعنی برا کرنے والوں کو برا بدلہ ملے گا اور بھلائی کرنے والوں کا انجام بھلا ہوگا۔ اور یہ کہ "لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" یعنی کیا ان لوگوں کے پاس صحف موسیٰ وابراہیمؑ کے ذریعہ یہ بات واضح نہیں کر دی گئی ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ وان لیس للانسان الا ما سعیٰ اور یہ کہ انسان کے پلے بجز اس کے کچھ نہ پڑے گا جس کیلئے اس نے دوڑ دھوپ کی ہوگی۔ وان سعیہ سوف یریٰ اور یہ کہ اس کی کمائی یقیناً اس کے سامنے لا رکھی جائے گی۔ ثم یجزاہ الجزاء الاوفیٰ۔ پھر اسے پورے کا پورا بدلہ دیا جائیگا۔ وان الیٰ ربک المنتہیٰ۔ اور یہ کہ آخر کار حاضری تیرے رب کے سامنے ہونے والی ہے۔

۳؎ پھر سلسلہ کلام کے تحت یہ باتیں آگے آتی ہیں کہ

(۱) اللہ ہی کے بس میں مسرت بھری زندگی بھی ہے اور دکھیارا جیون بھی۔

(۲) وہی مارتا اور جلاتا ہے۔

(۳) اسی نے مذکر ومونث کے جوڑے بنائے ـــ مادۂ حیات سے جبکہ وہ رقصہ

(۴) اور دوبارہ جلا اٹھانا بھی اسی کے ذمہ ہے۔

(۵) وہی مال ودولت دینے والا ہے۔

(۶) اور وہی ہے جس نے عاد کو، ثمود کو، گروہ فرعون کو ختم کیا۔ کیونکہ وہ انتہائی ظالم اور شقی بن گئے تھے۔

اس طرح اپنی ربوبیت والٰہیت اور اپنے بے پناہ اختیارات کا تذکرہ کرتے ہوئے پھر "الیٰ ربک المنتہیٰ" کی طرف بات لوٹا دی کہ "ازفت الآزفۃ" جب آن پہنچے آنے والی گھڑی۔ "لیس لہا من دون اللہ کاشفۃ" کوئی نہیں اللہ کے سوا اس کی گرفت کی گرہ کو کھول کر دکھانے والا ——— پھر مشرکین سے سوال کیا جاتا ہے کہ افمن ھذا الحدیث تعجبون۔ کیا یہی بات ہے جس پر تم کو حیرت ہوتی ہے۔ وتضحکون ولا تبکون اس پر تم رونے کے بجائے ہنستے ہو۔ وانتم سامدون۔ اور تم ہی غفلت زدہ ہو۔

خلاصۂ بحث

اب غور کیجئے کہ کیا اس سورت کا موضوع اصلی یا کوئی موضوع ضمنی معاشیاتی ہے؟ اس میں تو کہا جا رہا ہے کہ نبی صلعم کی دعوت کو تم جھٹلاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ شخص من گھڑت باتیں کر رہا ہے حالانکہ یہ وحی کردہ پیغام کو تم تک پہنچا رہا ہے۔ اس حقیقت بین کے پیغام کو جھٹلا کر تم اپنے قیاسات کو بڑی اہمیت دیتے ہو۔ لیکن تم اپنے قیاسات کے تحت جو کچھ خواہشات اور تمنائیں رکھتے ہو۔ یہ پوری ہونے کی نہیں ہیں۔ کیونکہ تمہارے اصنام، الٰہہ۔ اللہ کے حضور بالکل بے بس ہیں۔ اختیار جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اللہ کا سارا نظام اس طرز پر وجود میں آیا ہے کہ اس کے تحت برائی کرنے والوں کو آخرت میں بہر حال برے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور بھلائی کرنے والوں کیلئے آخری نتیجہ بھلائی ہوگا۔ یہ سمجھ لو کہ خدا کی بارگاہ میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک کے گناہوں کا بار اس سے ٹل کر دوسرے کے کندھوں پر لد جائے۔ بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جو کچھ کسی نے کارگذاری انجام دی ہو۔ اس کا حساب اسی کو ملے اور عین اس کارگذاری کے مطابق ملے، نہ کم نہ زیادہ۔ چنانچہ نوع انسانی کے ہر فرد کے سامنے اس کی پوری کمائی لا رکھی جائیگی کہ یہ ہے تیرا حاصل حیات۔ پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائیگا اور آخر کار تمہاری پیشی اللہ کے سامنے ہو کے رہیگی۔ وہ گھڑی ہر حال آنے والی ہے جس کا آنا مقدر ہے اُسے کوئی ٹالنے والا نہیں۔ آخر اس میں اچنبے کی بات کیا ہے؟

صدیقی صاحب نے مذکورہ بیان کے تین حصے کئے ہیں۔ قرآنی فکر کے ان تینوں نقاب کو الگ الگ اُلٹ دینے کی اجازت دیجئے۔ کاش مولانا اپنی قرآن فہمی کو نمایاں کرنے کے ذوق سے محروم ہوتے۔ کیونکہ فہم قرآن کے اس انداز نے پوری سورت کو ایک بے ربط، بے نتیجہ اور "ادب برائے ادب" کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اجتہادِ فکر کے دعوے اور علماء قدیم کی بلندیٔ فکر سے بھی آشنا نہ ہوتے ہوئے ایک ایسی دیوانگی ہے جسے کسی قیمت پر بھی نہیں خریدا جا سکتا۔

مولانائے محترم سورۂ نجم کی ابتدائی آیات کا ترجمہ کرنے کے بعد بتاتے ہیں کہ ان آیات کا مدعا، نبوت، حقیقتِ وحی پر گفتگو کرنا تھا۔ حالانکہ اگر مولانا "حقیقت وحی" کے فلسفیانہ یا صوفیانہ تصور کو سمجھ سکتے تو ان کی یہ مجال بھی نہ ہوتی کہ معراج کا تذکرہ کرنے والی آیات کو حقیقتِ وحی پر روشنی ڈالنے والی آیات قرار دیتے۔ ان ایات میں نہ حقیقتِ نبوت سے بحث ہے، نہ حقیقتِ وحی سے بلکہ معراج اور اس کے مشاہدات کا تذکرہ ہے۔ یا ان مشاہدات کا انکار کرنے والوں کے عقائد و تصورات کا ذکر خیر۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے مولانا کا اجتہادِ فکر خود معراج ہی کی کوئی قیمت محسوس نہیں کرتا۔ کافروں نے اگر اُسے کوئی اہمیت نہ دی تھی تو خدا سے لے کر مولانا تک سب ناراض ہو گئے لیکن جب خود مولانا نے فرمایا کہ

معراج کا مسئلہ نہ زندگی کے عملی معاملات سے کوئی تعلق رکھتا ہے، نہ دین کے بنیادی عقائد سے۔ (ترجمان القرآن جولائی تا ستمبر ۱۹۵۰ء)

تو جنت کی ساری حوریں مسکرا رہی تھیں اور زمین و آسمان کے تمام فرشتے پھول برسا رہے تھے۔ وہ معراج جسے قرآن نے زبردست عظمت و سربلندی قرار دیا تھا اور جس کے اقرار و انکار نے کفر و ایمان کے مورچے متعین کر دیئے، مولانا کے نزدیک نہ زندگی کے معاملات سے وابستگی رکھتی ہے، نہ عقائد سے۔ اگر اس معراج کا کوئی بھی نتیجہ نہ تھا اور اُسے آسمانی یونیورسٹی کی صرف اعزازی ڈگری ہی قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر قرآن کافروں سے یہ کیوں کہتا ہے کہ تم پیغمبرانہ معراج کا انکار نہ کرو۔ یہ جنون و دیوانگی کا زائیدہ خواب نہیں حقائق ہیں، جن سے انکار کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ کیا معراج کی سچائیاں، ان قیاسات سے ٹکرا رہی تھیں، جن سے کافروں نے اپنی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں اور جنھیں آٹھویں آیت میں غلط قرار دیا گیا ہے۔ اگر اللہ ہی مسرت بھری زندگی، دکھیارے جیون، موت و زندگی اور تخلیقی نیرنگیوں پر قابو رکھتا ہے تو معراج کا انکار کرنے والوں سے اس پہلو کا تذکرہ کرنا چہ معنی دارد۔ معراج پر یقین کرنے سے کفار کو کیوں انکار تھا؟ کیا وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے عیش و غم سے انکار و اقرار کا کچھ تعلق ہے۔ وہ عیش و غم نہیں جو بعد از مرگ میسر ہوگا۔ بلکہ وہ عیش و غم جس پر کنٹرول کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ اگر مادی عیش و غم کا معراج سے کچھ تعلق نہ تھا تو اگلی آیات میں اپنی مضبوط گرفت کا اندازہ کرانے کیلئے عاد و ثمود اور قوم فرعون کی سخت ترین تاریخی گرفتوں کا تذکرہ کیوں چھیڑ گیا۔ کیا خدا کا منشا پچھلی تاریخ سامنے رکھنے سے یہ نہ تھا کہ اگر تم نے معراج کی سچائیوں کا انکار کیا اور اسے دیوانگی سمجھا تو تمہیں بھی اسی تاریخی تباہی سے گذرنا پڑے گا جس کا مشاہدہ پچھلی قومیں کر چکی ہیں، چونکہ خدا کو زندگی کے تاریک و روشن پہلو اور تخلیقی تغیرات پر پورا پورا قابو ہے۔ اسلئے تم آج بھی غلط راستہ اختیار کر کے خوفناک نتائج سے نہ بچ سکو گے۔ تمہارے باطل خداؤں کی سفارش کوئی اثر نہیں رکھتی اور وہی ہو کر رہیگا جو سنت اللہ کا تقاضا ہے اور ہمارا اٹل قانون۔

مولانائے محترم چونکہ معراج کو سمجھ ہی نہ سکے کہ وہ کیا چیز ہے؟ پیغمبرانہ رہنمائی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اور مفاد پرست طبقہ اُسے تسلیم کرنے سے کیوں انکار کرتا رہا۔ اس لئے انھوں نے آیت کا سراسر غلط، عربی لغت و محاورہ سے بالکل الگ اور قرآنی فکر سے بے تعلق ترجمہ کرتے ہوئے ایک پُر فریب فقرہ میں معراج کے تصور کو اس طرح ادا کر دیا:

"نبی صلعم نے ایک کیفیت چشم بصیرت سے دیکھی ہے"

اگر معراج چند کیفیات و تاثرات کے مجموعہ کا نام تھا جسے وجدانی احساسات اور صوفیانہ مشاہدات بھی کہا جا سکتا ہے۔ تو پھر "چشم بصیرت" سے مادی معائنہ کا رنگ پیدا کرنا کیا ضرور تھا۔ کیوں صاف نہیں کہدیتے کہ معراج ایک نفسیاتی تاثر ہے۔ نہ پیغمبرانہ رہنمائی سے اس کا کچھ تعلق، نہ دینِ مکمل کے عقائد و تصورات سے ایک نفسانی کیف کا نام معراج رکھ دیا جائے یا کشف و مراقبہ، فرق کیا پڑا؟ نہ معلوم شخصی کیفیات ماننے پر عرب قوم کو کیوں مجبور کیا گیا اور ان سے دلچسپی نہ رکھنے والوں کو کافر کہنے کی کیوں جرأت کی گئی؟ کفر و ایمان کا تعلق عقائد و معاملات سے ہے اور جب معراج ان دونوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی تو اسے رد و قبول کیلئے پیش کرنا ہی بنیادی طور پر غلط تھا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آسکا کہ آخر کفار پر یہ کیا دیوانگی سوار ہو گئی تھی کہ ایک شخص کے پرائیویٹ تاثرات کے سچ اور جھوٹ ہونے پر جھگڑنے لگے۔ ان کے مفاد پر آخر کیا برا اثر پڑتا تھا ان کے تمدنی نظام میں کیا تبدیلی آتی معراج میں تو ایک یا دو خدا ہونے کی بحث و گفتگو بھی نہ تھی۔ سارے بت اپنی جگہ کھڑے رہتے پھر انتی "ضدم ضدا" نہ معلوم کیوں پیدا ہو گئی؟

مولانا نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ مشرکین بت پرستی کے "رنج" میں نبی صلعم کو جھٹلا رہے تھے۔ غالباً مولانا کو پاکستان آکر "رنج" کے ٹھیک ٹھیک معنی معلوم ہو گئے ہوں گے؟ "بے لگام اور زائد گدھے کا دوسرا نام ہے"۔ شاید مولانا یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ چونکہ عربوں کے دل میں

بے وجہ بت پرستی جم گئی تھی۔ اس لئے وہ خواہ مخواہ انکار کرتے رہے۔ حالانکہ اگر وہ اجتہادِ فکر کا دعویٰ نہ کرنے والے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی "اسلامی معاشیات" ہی ملاحظہ فرما لیتے تو انھیں اندازہ ہو جاتا کہ بت پرست اتنے بیوقوف نہیں ہوتے تھے کہ بلا وجہ مشرکانہ عقائد پر جم جاتے۔ بقول مولانائے گیلانی کے، بت پرستی بھی دراصل ایک "معاشی نظام" تھا۔ جب کوئی فرد یا قوم مفاد پرستی کی طرف جھک جاتی تھی اور انسانیت و خدا پرستی کی بنیادوں پر تقسیم دولت کرنا اُسے گوارہ نہ رہتا تھا تو تقسیم دولت کا مطالبہ کرنے والے خدا کو چھوڑ کر وہ ایسے خداؤں کو اپنا لیتے تھے جو ان کے مفاد کے خلاف نہ کچھ بول سکیں نہ اشارہ کر سکیں۔ ہمہ گیر خدا کے تصور سے انھیں بھی انکار نہ ہوتا تھا مگر چونکہ انھیں ایسے سفارشی مل جاتے تھے جو خدا سے گناہوں کو معاف کراتے رہیں اسلئے وہ براہِ راست خدا کی پرستش کرنے کی بجائے ذرا رُخ بدل دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تبدیلی ایک تحت الشعوری خوف میں بدل جاتی تھی۔ لہٰذا خدا کی جگہ بت کا خوف پیدا ہو جاتا اور وہ یقین کرنے لگتے کہ ان کی سفارشات خدا کے قانون کا راستہ بدل سکتی ہیں۔ دوسری قومیں ضرور تباہ ہوئی ہونگی مگر ہمارے سفارشی اتنے زوردار ہیں کہ ہمارا بال بیکا نہ ہوگا۔

ایسی صورت میں آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کافروں کا پیغمبر اسلام کو جھٹلانا خواہ مخواہ کی "ہٹ" تھی یا معاشی بنیادوں پر کھڑا ہونے والے نظامِ تمدن کا ٹکراؤ۔ ایسے مفاد پرستانہ نظامِ تمدن کا معراج سے انکار مضبوط اور گہرے اسباب و وجوہ پر مبنی ہونا چاہئے نہ کہ یونہی لیکن "ٹرو مینی مومن" کو کیا خبر کہ معراج کا وحیٔ رسالت، تاریخی قانون، پیغمبرانہ رہنمائی اور مفاد پرستانہ معاشی تمدن سے کچھ تعلق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ وہ بیچارا تو معراج کو نہ انسانیت کی عملی زندگی سے وابستہ تصور کر سکتا ہے، نہ انسانی شعور و احساس پر اثر انداز ہونے والا عقیدہ۔ حیرت ہے کہ دوسرے نیک دل مسلمانوں کو طعنہ دینے والے کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے۔ قرآن کی فکر مکمل اور اسلام کے ضابطۂ حیات سے واقفیت کا اگر یہی حال ہے اور اگر اسی بھروسہ پر ہم نادانوں، گنہگاروں اور "غیر صالح" بندوں کو رہنمائی دی جاتی رہی تو

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اپنے بیان کے دوسرے حصہ میں سب سے پہلے "برائی کا بدلہ برائی ہے" کا اعلان کرنے والی آیت کو نقل کرتے ہوئے مولانا "خلاصۂ بحث" میں فرماتے ہیں:

> اللہ کا سارا نظام اس طرز پر وجود میں آیا ہے کہ اس کے تحت برائی کرنے والوں کو آخرت میں بہرحال برے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا اور بھلائی کرنے والوں کے لئے آخری نتیجہ بھلائی ہوگا۔

میرے خیال میں قرآن کے ساتھ اس سے بڑا دھوکہ نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے تو اللہ کا سارا نظام لکھ کر قرآن کے فکری پہلو کو نقابِ زر میں چھپا دیا گیا پھر اس نظام کے تمام نتائج کو آخرت کی نئی زندگی تک مفلوج۔ آپ قرآن شریف اٹھائیے اور دیکھئے کہ وہ لیجزی الذین اساؤا بما عملوا (تاکہ بدلہ دیا جائے ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی جدوجہد سے حالات کو بگاڑا تھا) سے پہلے کیا کہتا ہے:

وللہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض لیجزی

اور خدا ہی کے کنٹرول میں ہے وہ سب کچھ جو آسمان میں ہے اور زمین میں، تاکہ بدلہ دیا جائے۔

یعنی خدا مادی کائنات کی ہر اس چیز پر جو بلندیوں یا پستیوں میں پائی جاتی ہے اسلئے کنٹرول رکھتا ہے تاکہ زندگی کے آرٹ کو حسین و جمیل بنانے کی جگہ یا اسے بگاڑنے والے نتائج سے گریز کی راہ نہ پیدا کر سکیں۔ مولانا نے اس سچائی کو زیرِ نقاب لانے کیلئے "سارے نظام" کا دھندلا تصور ایجاد کیا۔ جو دنیا و آخرت سب پر حاوی ہو سکتا تھا اور پھر اسے ادیبانہ فن کاریوں کے پردہ میں آخرت پر موقوف کر دیا۔ قرآن نے جس مادی نظامِ کائنات پر قابو یافتہ ہونے کا چیلنج دیا تھا چونکہ بدقسمتی سے ہمارے اسلامی مفکر صاحب اللہ میاں کی ایسی باتوں کو "شاعری" خیال فرماتے ہیں اسلئے اپنی

محبت سے ان کی بات کو ایسا گول مول کر دیا کہ نشانہ کی زد سے بچ گئے۔ ماشاء اللہ حکومتِ الٰہیہ پر کتنا ایمان و یقین ہے۔ پاکستان کے دستور میں خدا کی حاکمیت درج کرنا ضروری ہے۔ چاہے دل نہ مانے۔ بیچارے خدا کو مطبوعہ دستور کے علاوہ دل کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ منزا کیونکر دے گا حالانکہ قرآن اس پہلو کو بھی صاف کرتے ہوئے یہیں کہیں کہہ چکا:

هو اعلم بكم —— فلا تزكوا انفسكم هو اعلم بمن اتقى

وہ تمہیں ہر دوسرے سے زیادہ جانتا ہے۔۔ اس کو اپنی پاک دامانی کی داستان نہ سناؤ۔ وہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے والے کو خوب جانتا ہے؛

مولانائے محترم سے میری درخواست ہے کہ وہ خدا کے قانون اور اس کی یگانہ طاقت کا مسلم عوام کو یقین دلانے سے پہلے خود یقین تک پہنچنے کی کوشش فرمائیں۔ جس مفکرِ اسلام کو یہ یقین ہی نہیں کہ کائنات ہست و بود کی پہنائیوں اور اس کے طویل ترین تاریخی منزلوں پر خدا کنٹرول رکھتا ہے وہ آخرت پر جتنا پختہ ایمان رکھتا ہوگا اسے سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں اور بے یقینی تاریخ میں کبھی یقین کو وجود نہ دے سکی۔

اگر واقعی اسلامی جماعت کے مفکرین کو یقین ہے کہ اتنا بڑا کارخانۂ حیات، خدا کے کنٹرول سے نکل چکا ہے۔ خواہ آخرت کی وسعتیں خدا کے دائرۂ اقتدار میں شامل ہوں تو انھیں صاف کہہ دینا چاہیئے تاکہ انسانیت سوچ سکے کہ آسمان کی بادشاہت خدا کو اور زمین کی بادشاہت انسان کو دینا مناسب ہوگا یا نہیں۔

دوسرا فریب تخیل جس میں مبتلا کرنے کیلئے مولانائے محترم نے اپنے اس درمیانی حصۂ بیان کو مخصوص فرمایا تھا "لیس للانسان الا ما سعٰی" والا ٹکڑا ہے۔ مولانا صاحب نے ان آیات کا ترجمہ ہی درمیان سے صاف کر دیا جو "سعی و وزر" (کوشش اور بوجھ) کا تصور معین کر رہی تھیں۔ قرآن نے مذکورہ آیت سے پہلے کہا تھا:

افرأيت الذی تولّٰی، واعطٰی قليلًا واكدٰی۔ اعندهٗ علم الغيب فهو يرٰی۔ ام لم ينبأ بما فی صحفِ موسٰی وابراهيم الذی وفّٰی۔ الا تزر وازرة وزر اخرٰی وان ليس للانسان الا ما سعٰی۔

کیا تو نے اس شخص کے کردار کا مطالعہ کیا جس نے (ہمارے ضابطۂ حیات سے) منہ موڑتے ہوئے ضرورت مندوں پر بہت تھوڑی سی رقم خرچ کی۔ بڑا سنگ دل نکلا۔ کیا اُسے ان دیکھے مستقبل کا حال معلوم ہے۔ اس حد تک گویا کہ وہ سارے نتائج کا مشاہدہ کر رہا ہے کیا تم حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیم کے (جس نے اپنا وعدہ پورا کیا) اوراقِ ہدایت میں درج نہیں کر دیا تھا۔ کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور یہ کہ یقیناً انسانیت کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کیلئے اس نے جد و جہد کی تھی۔

تاکہ یہ چیز صاف ہو جائے کہ جس کوشش اور جس بارِ گراں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے وہ اس مالیاتی سسٹم سے متعلق تھا جسے زر پرستی نے پیدا کیا ہو۔ تقسیمِ دولت سے ہاتھ کھینچ لینے والوں کو قرآن خدا کے ضابطۂ حیات سے منہ موڑ لینے والا کہتا اور ایسے مفاد پرستوں ہی کو یاد دلاتا ہے کہ ہم عرب نسل کے قدیم ترین پیغمبر کے زمانہ سے لیکر جنھیں حضرت ابراہیم کہا جاتا ہے اور جنھوں نے مفاد پرستی سے بلند ہو کر ہمیشہ پوری پوری تعمیل حکم کی تھی۔ برابر کہتے چلے آئے ہیں کہ کسی قوم کا مفاد پرستانہ اقتصادی نظام اسی قوم کو تباہ کن نتائج سے دوچار کرتا رہا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک قوم گناہ کرے اور دوسری قوم اس گناہ کے نتائج برداشت کرے۔ تمہیں ہرگز یہ خیال نہ کر لینا چاہیئے کہ تم کسی دوسری طاقت کے سہارے اپنے کاندھوں کا بوجھ دوسری قوموں کے سر ڈال سکو گے۔ جس ملک و قوم میں انسانی جد و جہد کا رخ متوازن یا غیر متوازن اقتصادی نظام میں سے جس سمت بھی ہوگا۔ نتائج بھی اسی سانچہ میں ڈھل کر نکلتے رہیں گے۔ چنانچہ تباہ کن انقلاب کا وہ نازک لمحہ، جبکہ پرانے نظام کے نشانات بھی مٹا دیئے جاتے ہیں۔ پچھلی تاریخ کی

لائن پر چلتے ہوئے، تمہاری بستیوں تک آپہنچا ہے۔ اگر اب بھی تم نے زرپرستی کو نہ چھوڑا تو وہ ہی کچھ ہو کر رہے گا جو حضرت نوحؑ کے ابتدائی دور سے لے کر ہر تہذیب میں ہوتا رہا ہے اور جسے قانونِ ربوبیت کے نوازشات میں سے شمار کرنا چاہیئے۔ اگر خدا کے زندہ قانون میں رکاوٹ بن جانے والی قوتوں کو تباہ نہ کیا جاتا تو پست و بلند کائنات پر قابو یافتہ ہونے نہ ہونے کے درمیان کچھ بھی فرق نہ کیا جا سکتا تھا۔

قرآن کے نزدیک سرمایہ داروں کا یہ عقیدہ کہ ان کا سرمایہ مستقبل کو خوشگوار بنا سکنے کا ذمہ دار ہے۔ قطعاً درست نہیں۔ چاہے ان کے انداز گفتگو سے یہی پتہ چلتا ہو کہ انھیں مستقبل کے تمام نقشے معلوم ہیں۔ اور ان کے طے ہوئے نتائج کے سوا، کوئی مختلف نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ ان کی توقعات کے خلاف پھر وہی نازک وقت آگیا اور اس طوفانی انداز سے آیا ہے کہ خدا کے سوا کائنات کی کوئی دوسری طاقت اس آندھی کو کاٹ نہیں سکتی۔ تم مستقبل میں پیدا ہونے والے ان تاریخی نتائج کا مذاق اڑا رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں پیش آنیوالی تباہی کے خیال سے آنسو بہانا چاہیئے تھا۔ یہ تاریخی نتائج کوئی اتفاقیہ چیز نہیں ہیں جن پر تمہیں تعجب کا حق ہو۔ تاریخ ہمیشہ اسی طرح کام کرتی رہی اور ہمیشہ یونہی کام کرتی رہیگی۔ یہ کسی قوم کے لئے تبدیل نہیں کی جاسکتی۔

افنضرب عنکم الذکر صفحًا ان کنتم قومًا مسرفین (زخرف)

کیا ہم تمہارے لئے تاریخی یادداشت کو تبدیل کر دینگے۔ درگذر کرتے ہوئے اگر تم قدرتی ڈگریوں سے گذر جانیوالی پارٹی میں سے ہو جاؤ گے۔

بدنصیب مسلمان قوم بھی اسی مالیخولیا میں گرفتار ہو گئی تھی کہ شاید ہمارا مذہبی نقاب ہمارے لادینی آرٹ کو نمایاں نہ ہونے دے سکے گا اور اس طرح ہم فریب تخیل میں مبتلا ہو کر قانونِ قدرت کو بھی فریب دے سکیں گے۔ مگر وہاں تاریخ کی سمت کسی کے لئے بھی نہیں بدلتی چاہے عرب کے کافر ہوں، یا دنیائے اسلام کے زندہ دل مومنین۔

اگر خدا اپنی طاقتوں کی نمائش کیلئے تنہا بعد از مرگ کی زندگی ہی میں برے نتائج کی دھمکی دے رہا ہوتا تو انسانی فکر و نگاہ اپنی کوتاہی پرواز کے لحاظ سے حق رکھتی تھی کہ اس طاقت کی فتحمندی میں شک کرے جو زندگی پر قابو نہ پانے کے بعد موت پر قابو یافتہ ہونے سے خوف زدہ کر رہی ہو۔ اگر کائناتِ زندگی میں ایک ہی طاقت اور ایک ہی قانون کام کر رہا تھا تو انسانیت کی پوری تاریخ اس کے نشانہ سے کیونکر باہر ہو سکی۔ وہ حق جو باطل کا مغز سر نکال دیتا ہے پوری زندگی میں باطل سے کیسے شکست کھا گیا؟ "ما انتم بمعجزین فی الارض" (مادی زندگی میں تم ہمیں شکست خوردہ نہیں بنا سکتے)۔ کا دعوٰی کرنے والا، زندگی کے کسی گوشہ میں بھی کیوں بازی نہ لے جاسکا؟ مگر جب قرآن صاف کہہ رہا ہو کہ کائناتِ پست و بلند کی طاقتوں پر کنٹرول ہی اسلئے رکھا گیا تھا کہ مجرم نگاہ بچا کر بھاگ نہ سکیں تو یقیناً کسی منکر کو حق نہیں پہنچتا کہ تاریخ کا بار بار دوہرایا جانے والا سبق پڑھنے پر تعجب کرے۔ ایسے تعجب نہ کرنا چاہیئے، نہ ہنسی اڑانا، نہ تفریح بازی کرنا۔ بلکہ ناقابلِ شکست طاقت کے آگے بلا شرط ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔

فاسجدوا للہ واعبدوا۔　(خدا کے آگے سرِنگ دو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔)

یہانتک آیت کا پس منظر اور پیش منظر پڑھنے کے بعد اُن فقرات کو دہرائے جو نعیم صاحب صدیقی نے دعوتِ فکر دیتے ہوئے تحریر فرمائے تھے۔

اب غور فرمایئے کہ کیا اس سورت کا موضوع اصلی یا کوئی موضوع ضمنی معاشیاتی ہے:-

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ساری سورت از اول تا آخر معاشی زندگی سے وابستہ ہے مگر ہمارے جدید مفکرین "فکرِ پس خوردہ" کے سہارے معادسے متعلق کر رہے ہیں۔ ان سے زیادہ کون واقف ہوگا کہ عام طور پر مسلمان کا یہ "لاشعوری مذہب" بن گیا ہے کہ ہر آیت کو موت پر اٹھا رکھے۔ خدا کو شکست کی رسوائیوں سے

محفوظ رکھ سکنے کیلئے بیچارے ایسی حرکتیں کرتے رہے ہیں حالانکہ انھیں یقین ہونا چاہئے تھا کہ خدا آسمانی بادشاہت ہی نہیں رکھتا۔ زمین پر بھی اسی کی بادشاہت قائم ہے اور ہر انسانی بغاوت کا تاریخی جواب دینے کی طاقت رکھتے ہوئے دستور میں حکومتِ الٰہیہ کا تذکرہ کر دینے سے تاریخی نتائج کا رخ نہیں پلٹ سکتا۔ پہلے دل میں یقین پیدا کیجئے کہ جس زندگی کیلئے ہم قانون سازی کر رہے ہیں وہ کسی بالاتر طاقت کے زیرِ اثر بھی ہے یا آزاد جمہوریہ بن گئی۔

اس ساری تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ النجم کی سورت کا عمودِ کلام بنیادی تصور اور محورِ فکر معاشیات کا عمومی نظام نہیں بلکہ صرف اقتصادی نظام ہے۔ زیادہ سے زیادہ نفیٔ زر کو خدا پرستی کی طرف رجحان کا نام دیا گیا ہے اور کم سے کم تقسیم دولت کرنے والے ذہن و کردار کو خدا سے منہ موڑ لینے والوں کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ اسی دوراہے پر کھڑے ہو کر انسانی طاقت کو خرچ کرنے والوں سے کہا گیا تھا کہ جس سمت بھی آگے بڑھ سکنے کی سعیٔ پیہم کرو گے اسی کے منطقی نتائج سے گذرنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں انصاف کیجئے کہ اگر کسی اسلامی مفکر نے اقتصادی نظام اور اُس کے تاریخی نتائج پر روشنی ڈالنے والی سورت کی کسی ضمنی آیت سے معاشیاتی ضابطہ بنایا تو کون سی ایمان فروشی ہوئی۔ ہاں اگر کسی ایک آیت سے قانونی دفعہ پیدا کرنا ہی جرم ہو تو ضرور گناہ کے داغ سے دامن کو بچایا نہ جا سکے گا۔ لیکن

این گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

خود نعیم صاحب نے "الرجال قوامون علی النساء" والی آیت کے آخری ٹکڑے "وبما انفقوا من اموالہم" (اور اس بنا پر بھی مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنی دولت ان پر خرچ کرتے ہیں) سے یہ فقہی مسئلہ ایجاد کیا کہ

عورتوں کو اس سے بے نیاز ٹھیرایا گیا ہے کہ وہ اپنی ضروریات اپنی ہی محنت سے بہم پہنچائیں۔

کیا مولانا بتا سکیں گے کہ سیاق و سباق سے اس مسئلہ کا کیا تعلق ہے؟ اور صرف ایک آیت سے انسانی سوسائٹی کے نصف تمدنی حصہ کے لئے اقتصادی سسٹم طے کر دینے کا حق کیسے قائم ہو گیا۔ خصوصاً جبکہ ولا تتمنوا (تم اپنے مردوں کی دولت حاصل کر سکنے کی تمنا نہ کرو) کا آرڈر بھی دیا جا چکا۔ اگر مجھے محنت کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے گا تو منطقی طور پر میرے تمام مفادات آرزوں اور طبعی خواہشات کا تعلق اسی سے دور ہو جائے گا جسے تنہا ذمہ دار بنا دیا گیا تھا۔ مجھے بے بال و پر بنا کر فضا میں پرواز کرنے والے پرندوں کی آزادی پر حسرت بھری نگاہ ڈالنے سے بھی روک دینا نہ معلوم اس دینِ مکمل کا کونسا تقاضہ ہو سکتا ہے جس کا دوسرا نام دینِ فطرت بھی رکھا گیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ قرآن نے تمنا کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ شاید بھول کر یہ بھی کہہ دیا گیا کہ وللنساء نصیب مما اکتسبن (عورتوں نے جو کچھ کمایا ہو وہ انہی کا حصہ رہے گا)۔

عجیب معاملہ ہے کہ ایک طرف "بے نیاز" بنایا جا رہا ہے اور ایک طرف "نیاز مند"۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای   باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

پھر نیاز مندی کا محاذ مضبوط بنانے کیلئے یہاں تک کہہ دیا گیا واسئلوا اللہ من فضلہ۔ ان اللہ بکل شیٔ علیم (نساء)۔ (خدا کی معاشی سہولتوں سے اپنی مانگ وابستہ کرو، کیونکہ وہ ہر چیز (زندگی کے ہر پہلو) کو جانتا ہے۔) گویا کہ خدا کا وہ معاشیاتی قانون جو اس کائنات میں کام کر رہا ہے عورتوں کو دولت مند کرنے کیلئے کافی ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ عورتیں سوسائٹی میں تضاد کو ابھارنے والا راستہ اختیار کرنے کی بجائے وہ راہ کیوں نہ اختیار کریں جو انھیں بھی خدا کے فضل اور اس کے معاشی سرمایہ کے ذریعہ مردوں پر رشک کرنے کی کمزوری سے دور رکھ سکتا ہو۔

اگر خدا عورتوں کو بے نیازِ محنت بنانا چاہتا تو کیا نئے اور الگ معاشی گوشے اختیار کرنے کی اپیل کر سکتا تھا۔

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجا است

دراصل بیگم لیاقت علی خاں کی ضد میں اسلامی جماعت اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ اب اسے سچائیوں کو روندتے ہوئے گذر جانے سے بھی عار نہیں آتا۔ ردِّ عمل کے اثر سے اگر بالکل محفوظ رہنا ممکن نہ ہو تو کم از کم دل و دماغ پر قابو پاکر اسے پابندِ حدود ضرور بنا دینا چاہئے۔

مولانائے محترم! جس آیت کو آپ نے "محنت سے بے نیازی" کے لئے استعمال فرمایا تھا اُسے دوبارہ مطالعہ فرمائیے تاکہ آپ اندازہ کرسکیں کہ ماضی کے صیغہ سے اس قدیم ترین تمدنی سانچہ کی ترجمانی کی جارہی ہے جو نہ صرف ہزاروں برس سے چلا آرہا تھا بلکہ نہ معلوم کتنے ممالک میں کئی ہزار سال تک بھی مٹنے والا نہیں۔ بین الاقوامی سوسائٹی جن بنیادوں پر معاشرتی زندگی بسر کرتی رہی اس کا سبب صرف جسمانی اور دماغی طور پر مرد کا ممتاز ہونا ہی نہ تھا بلکہ اس امتیاز نے جو ذرائع دولت اور عورت پر کنٹرول کرنے کی جو طاقت سپرد کردی تھی اس نے بھی عورتوں کو ہر طرح مردوں کا ماتحت بنادیا۔ بہر حال کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ واقعہ ہے کہ چونکہ مرد ہی عورت کی تمام ضروریات پوری کرتا رہا اس لئے اسے تمدنی تفوق حاصل ہوگیا اور ایسا تمدنی تفوق کہ جب تک عورتوں کو قدرت کے خزانے سے اپنا دامن بھرنے کا موقعہ نہ ملے گا انھیں مردوں کا محتاج ہونے کی پوزیشن قبول ہی کرنا پڑیگی۔ انکار کے دوسرے معنی فتنہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے۔ جو طبقہ اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس کا طاقتور سے الجھنا اور الجھتے رہنا سوسائٹی کو نفرت، دشمنی اور ناخوشگواریوں سے ضرور لبریز کرسکتا ہے لیکن ٹھوس نتائج نہیں پیدا کرسکتا۔ ہاں تمدنی ارتقاء سے، عورتوں کیلئے جو نئے ذرائع دولت پیدا ہوتے جارہے ہیں اگر ان سے منظم طور پر فائدہ اٹھایا جائے تو مرد و عورت کا وہ اقتصادی تضاد جسے نہ ابھارنے کی ہدایت مذکورہ آیت میں کی گئی تھی بہت جلد مٹا یا جاسکے گا اور تمدن کا وہ تاریخی موڑ جہاں عورتیں اقتصادی طور پر مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہوں۔ نہ صرف انسانیت کے لئے قابل فخر بلکہ اس آیت کی منشا کے بھی خلاف نہ ہوگا جسے مولانائے صدیقی عورتوں کو اقتصادی طور پر مردوں کا محتاج بنائے رکھنے کیلئے استعمال فرمارہے ہیں۔

یہ ایک ضمنی بحث آگئی ورنہ صرف اتنا ہی دکھانا منظور تھا کہ ایک آیت سے مسئلہ پیدا کرلینے پر حکیم حیدر زماں صاحب کو نشانۂ ملامت بنانے والے بھی یہی گناہ کررہے ہیں اور اتنے غیر علمی انداز میں کہ پچھلے زمانہ کا کوئی بھی فقیہ ایسے طرزِ استنباط کو گوارہ نہ کرسکتا تھا۔ ہٰذا اگر نعیم صاحب صدیقی کو یہ حق ہے تو دوسرے "صدیقی صاحب" کو بھی اس کا حق رہے گا۔ دونوں ایک دادا کی اولاد ہیں اور دونوں برابر کے وارث۔

دولت کی مساویانہ تقسیم قرآن کی روشنی میں

اقتصادی جمہوریت میں مساویانہ تقسیم کا کیا تصور ہوسکتا ہے۔ مولانا نعیم صاحب اس سلسلہ میں عوام کو ایک مغالطہ میں مبتلا کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

> ایک کے پاس ہو تو سب کے پاس کمبل ہوں، ایک موٹر گاڑی خریدے تو بقیہ تمام لوگوں کو سائیکلیں، بیل گاڑیاں، تانگے آگ میں جھونک دینے چاہئیں کہ لاؤ ہمیں بھی موٹر گاڑی دلواؤ۔ ایک کارخانہ کھولے تو دوسرے بھی ایسے ہی کارخانے کھول لیں۔

چند صفحات کے بعد اس کا دوسرا رخ دکھایا جاتا ہے:

> کوئی تمدن تفاوتِ رزق سے بالکل پاک نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مارکس کے مومنین بھی جب اپنا عملی معاشرہ قائم کرنے چلے تو ان کی خیالی جنتوں کے سارے محل اور مینار زمین پر آرہے۔ (ترجمان القرآن ج ۳۵ ع ۱ ص ۲۶ ۱۹۵۰ء)

میں نے مولانائے محترم پر مغالطہ آفرینی کا الزام اس لئے لگایا ہے کہ میں یہ قیاس بھی نہیں کرسکتا کہ مولانا اعتدال، مساوات اور توازن کا علمی تصور نہ سمجھ سکتے ہوں گے۔ انھیں معلوم ہے کہ گرم و سرد منطقوں میں معتدل منطقے بھی پائے جاتے ہیں اور مزاجی کیفیات میں اعتدالِ مزاج کا تذکرہ بھی انھوں نے ضرور سنا ہوگا پھر وہ کیسے خیال کرسکتے ہیں کہ اعتدال و مساوات کا مطالبہ وہ ذہنی تصور ہے جو کبھی عمل میں نہ آسکا۔ حقیقی معنی میں اعتدال، مساوات اور توازن کا وجود آج تک نہیں پایا جاتا۔ ہمیشہ ان اصطلاحات سے وہی پہلو مقصود ہوتے ہیں جو نقطۂ اعتدال سے قریب تر ہوں

ورنہ اگر مولانا ہی کا تصور درست تھا اور اس بنیاد پر انھیں یہ کہنے کا حق ہو گیا ہے کہ "اشتراکی معاشرہ کی خیالی جنت کا ہر محل اور ہر مینار زمین پر آرہا" تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اشتراکی سوسائٹی اپنے فلسفہ اور پروگرام کے خلاف جس معاشی نظام سے گذر رہی ہے وہ "تفاوتِ رزق" کا نظام ہونے کی وجہ سے اسلامی نظام بن گیا ہے یا نہیں۔ اگر انکار ہے تو اس کی وجہ کیا؟ جبکہ اسلام و کفر دونوں ایک ہی شاہراہ پر چل رہے ہیں اور اگر اقرار ہے تو وہاں تفاوتِ رزق کا جو نظام قائم ہے اسے اپنی مملکت میں جاری کرنے کی اجازت دیجئے مگر ایسا نہیں ہوگا کیوں؟ اسلئے کہ دراصل اسلامی جماعت تفاوتِ رزق کو اسلام کا اقتصادی نظام سمجھ کر امریکن نظام یا برطانوی نظام سے دلچسپی نہیں لے رہی۔ بلکہ اس کا مدعا تفاوتِ رزق اور دولت کے نشیب و فراز کو اتنا بڑھا دینا ہے کہ ایک طبقہ ہمیشہ بہت زیادہ غریب رہے اور ایک طبقہ بہت زیادہ مالدار۔ اگر خدا کو تفاوتِ رزق ہی پسند تھا تو خود نعیم صاحب کے نزدیک اشتراکی بھی وہی کر رہے ہیں جس سے خدا خوش ہو سکتا تھا لیکن وہ پھر بھی ناراض ہیں۔ بات صرف یہی ہے کہ جب تک کارخانہ داری کا نظام سرمایہ دارانہ ذہن کے سایہ میں نہ ہو کوئی دوسرا نقشہ اسلامی جماعت کے خدا کو پسند نہیں آسکتا۔ چاہے اس طرح بھی اس کی مرضی پوری ہو رہی ہو۔ یہی تفاوتِ رزق جب بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں پیدا ہوا تو اسلامی جماعت والوں نے اسے ظالمانہ اور طاغوتی نظام بتایا مگر جب سیاسی انتخابات میں کامیاب ہونے کیلئے زمینداروں وغیرہ کا سہارا لینا ضروری محسوس ہوا تو اسی کو اسلام کا ابدی قانون بنا دیا گیا۔

مولانائے موصوف نے جس آیت سے اقتصادی توازن کو غلط قرار دیا تھا وہ حسب ذیل ہے:۔

وقالوا لولا نزّل ھذا القراٰن علی رجل من القریتین عظیم۔ اھم یقسمون رحمت ربک نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیاۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا ورحمت ربک خیر مما یجمعون (زخرف)

اور انھوں نے کہا کہ یہ قرآن عرب کی دونوں مرکزی آبادیوں میں کسی آبادی کے بڑے آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا؟ کیا وہ تیرے پروردگار کی مہربانی کو بھی تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟ ہم نے انسانی گروہ کے درمیان ان کے معاشی پہلوؤں کو حیاتِ دنیا میں ضرور تقسیم کر دیا ہے اور کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں سے معاشی مدارج میں ایک دوسرے سے بلند و پست بھی۔ تاکہ ہر ایک دوسرے کو اپنے کام میں استعمال کر سکے۔ مگر تیرے پروردگار کی مہربانی، ان معاشی ذرائع سے زیادہ نفع بخش ہے جنھیں وہ جمع کر رہے ہیں۔[1]

حالانکہ مولانائے محترم اچھی طرح جانتے ہیں کہ "معیشت" تنہا اقتصادیات اور مالیاتی سسٹم کیلئے استعمال ہی نہیں ہوتی۔ یہ مادی زندگی کی تمام ضروریات اور اس کے تمام پہلوؤں کیلئے ایک جامع اصطلاح ہے نہ کہ کسی ایک گوشۂ حیات کی ترجمان۔ کافروں نے بھی "رجل عظیم" کی اصطلاح استعمال کی تھی اور آپ جانتے ہیں کہ بڑا آدمی ہونے کیلئے تنہا دولت مندی صرف اسی وقت کام آسکتی ہے جبکہ کسی سوسائٹی کیلئے وہ تعجب انگیز حد تک پہنچ جائے۔ ہاں علم اور اقتدار ایسی چیزیں ضرور ہیں جو بغیر دولت کے بھی ہر ملک میں بڑے آدمی پیدا کرتی رہیں۔ مفسرین نے بھی "رجل عظیم" کا تصور متعین کرنے کیلئے "سرداری اور دولت" دونوں کو جمع کیا ہے۔ دراصل منکرین کا اعتراض بھی صرف یہ تھا کہ سوسائٹی میں جو لوگ خاص اعزاز کے مالک ہیں انھیں ہی یہ علم و رہنمائی بھی سپرد کرنا چاہئے تھی یہ کیا طریقہ ہے کہ بے اثر شخصیتوں کو اتنا بلند مقام سپرد کر دیا گیا۔ قرآن نے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ انسانیت کا معاشی نظام تفاوتِ مدارج کے ساتھ ضرور بنایا گیا ہے لیکن خدا کی وہ نوازشات جو کائناتی نظام کے زائیدہ پہلوؤں میں سے نہیں۔ جیسے پیغمبر اور ان کی الہامی کتابیں، بلکہ ان مہربانیوں میں سے ہیں جنھیں زندگی کو نشو و نما دینے والے کی سہولت آفرینیوں نے پیدا کیا تھا۔ لہذا اس کیلئے انتخاب کا معیار

---

[1] ایک دوسری آیت میں معاشی تفاوت کو "لیبلوکم بما اٰتٰکم" (تاکہ سرمایہ کے ذریعہ تمہارا امتحان لیا جائے اور پرکھا جائے) سے بھی ربط دیا گیا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تفاوت سے معاشی برتری کے تقاضے پورے کرانا مقصود تھا نہ کہ غریبوں کو تفاوت پر راضی رکھنا۔ (ابوالنظر)

عام معاشی معیار کو نہیں بتایا جا سکتا۔

پھر قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ تفاوتِ مدارج کے معاشیاتی نظام کے بارے میں بھی تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے۔ وہ تفاوتِ مدارج اسلئے نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی خدا کا خاص بندہ تھا اور کوئی نہیں۔ بلکہ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اگر معاشی صلاحیتوں میں تفاوت نہ ہوتا تو تمدنی زندگی کو ترقی دینے کیلئے امدادِ باہمی سے کسی کو دلچسپی نہ ہو سکتی۔ چونکہ ہر شخص طرح طرح سے معاشی زندگی میں ایک دوسرے کا محتاج ہے اس لئے ہر فرد اجتماع کے مفاد میں کام کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر ایسا نظامِ زندگی نہ بنایا جاتا تو "کسے را بکسے کارے نباشد" والی حالت تمدن کو نشوونما پانے کی کوئی سہولت بھی نہ دے سکتی۔

کیا اس طرح یہ چیز صاف نہیں ہو جاتی کہ قرآن نے نہ صرف تعلیم دستور اور براہِ راست اپنی رہنمائی کیلئے شخصیت کے انتخاب ہی کو کائناتی قانون سے بالاتر بتایا تھا بلکہ اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا گیا کہ مادی زندگی کے صدہا گوشوں میں جو تفاوتِ مدارج پایا جاتا ہے وہ بھی اجتماعی معاشیات کو ترقی دینے کے لئے ہی پیدا کیا گیا تھا۔ اسلئے نہیں کہ ایک کو عمر بھر کیلئے مزدور اور دوسرے کو سرمایہ دار بنا دیا جائے۔ ایک کیلئے ہمیشہ صبر و شکر کا وعظ سنتے رہنا رہ جائے اور دوسرے کے لئے تقسیم دولت نہ کرنے میں قانونی پابندیوں سے آزادی۔

مولانا کا ادیبانہ کمال دیکھئے کہ جو آیت غریبی اور امیری سے بحث ہی نہیں کر رہی تھی اسے اجتماعی معاشیات کی بلندی سے نیچے اتار کر زمینداروں اور کارخانہ داروں کیلئے ابدی قانون بنا دیا گیا۔　　این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اگر واقعی مولانا کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ لکھ پتی اور کروڑ پتی حضرات کا محاذ مضبوط بنانے ہی کیلئے آیت نازل کی گئی تھی۔ تو آخر

وان کل ذلک لما متاع الحیٰوۃ الدنیا والاٰخرۃ عند ربک للمتقین (زخرف)

اور یہ سب سامانِ عیش، قریبی زندگی کا سرمایہ ہے اور مستقبل کی نئی زندگی، زندگی کو نشوونما دینے والے کے نزدیک ان ہی لوگوں کو میسر آسکے گی جو اخلاقی تقاضوں پر عملی زندگی بسر کر رہے ہوں۔

کے پیشِ نظر ہی کہہ دیا ہوتا کہ یہ دنیاوی سرمایہ چند روزہ اور بے قیمت ہونے کی وجہ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا زمینداروں اور کارخانہ داروں سے مطالبہ کیا جاتا کہ وہ بلند درجہ پر ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے کم از کم "العفو" تو تقسیم کر دیں کیونکہ ضروریات سے بچی ہوئی رقم کو خدا بھی خرچ کرا دینا چاہتا ہے۔ اگر اتنا بھی ہوتا تو کچھ نہ کچھ اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر ایسے مطالبات پر زور دینا سیاسی انتخابات جیتنے میں زبردست رکاوٹ بن سکتا تھا لہٰذا سرمایہ داروں کی مرضی پر ہی چھوڑ دیا گیا۔ اگر وہ دوسروں کی زندگی کو دوزخ بناتے ہوئے خود جنت کا عیش نہیں چاہتے تو اپنی کوٹھیوں میں مزہ کرتے رہیں۔ "تفاوتِ رزق" کا قانونِ الٰہی ان کی حفاظت کیلئے خدا نے پہلے ہی بنا دیا ہے۔

صدیقی صاحب جب قرآن سے تفاوتِ رزق ثابت کر چکے تو اب انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ سے بھی سند پیش کی جائے تاکہ کیمیا میں ایک آنچ کی کمی نہ رہ جائے۔ فرماتے ہیں۔

> اگر مساواتِ رزق کا اصول کوئی شرعی وجوب اپنے ساتھ رکھتا تو نبی صلعم اور حضرت عثمانؓ میں تفاوتِ رزق نہ ہوتا اور ہوتا تو حضرت عثمانؓ کا مقام نبی صلعم کے اولین مقربین میں نہ ہوتا بلکہ مبغوضین میں ہوتا —— دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کی سوسائٹی میں تفاوتِ رزق کی فطری حالت قائم رہی اور کسی کو یہ گمان بھی نہ گزرا کہ آیت "واللہ فضل بعضکم" کی رو سے یہ نظام کفرانِ نعمت کا نظام ہے۔　　(ترجمان القرآن ج ۳۵ ص ۲۶ ۵۰ء)

پہلے تو میں مولانا سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ واللہ فضل بعضکم والی آیت میں اپنی دولت کو ماتحتوں پر تقسیم کرنے کا جو مطالبہ

کیا گیا تھا تاکہ اس تمدنی معیار تک بلند کیا جاسکے جس پر سرپرست حضرات کھڑے تھے۔ کیا حضرت عثمانؓ جیسے دولت مندوں نے اس مانگ کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی یا نہیں۔ کیا انھوں نے اپنے ماتحتوں ہی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کو بھی ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاسکنے کا موقعہ دیا تھا یا نہیں، جو انھیں روزمرہ کی زندگی میں حاصل تھے۔ اگر انھوں نے اپنے تجارتی سرمایہ کو جمع کرنے کی بجائے ہر موقعہ پر تقسیم ہی کیا ہو اور کبھی زراندوزی کے ذہن و کردار سے اثر پذیر نہ ہوئے ہوں تو آپ نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے انھیں جو نعمت دی تھی اس کے تقاضہ کو پورا نہ کرتے ہوئے کفرانِ نعمت کا ارتکاب کیا۔ پیغمبر اسلام کو حضرت عثمانؓ کیوں عزیز نہ ہوتے جبکہ ان کا سرمایہ ہر اجتماعی اور انفرادی ضرورت پوری کرنے کیلئے وقف رہتا تھا۔ آپ کو عہد نبوت کے متعلق یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہوگئی کہ اس سوسائٹی میں زندگی بسر کرنے والے دولتمندی کے تقاضوں کو پورا نہ کرتے تھے" واللہ فضل بعضکم" میں جس کردار پر نکتہ چینی کی گئی تھی اور جسے اپنی دولت واپس نہ کرنے والوں میں شمار کیا تھا۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ صحابہ کرامؓ ایسا ہی کیرکٹر رکھتے تھے ہم انفرادی طور پر اس ماحول کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے جس میں ہر شخص یکساں تمدنی معیار تک پہنچ گیا ہو۔ ہاں ہمیں اپنے تمام ذرائع عوام کے تمدنی معیار کو بلند کرنے کیلئے ضرور وقف کردینے چاہئیں۔ صحابہ کرامؓ نے یہی کیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت جلد مفلس عربوں کی سوسائٹی اس صبح و شام سے آشنا ہوگئی جس میں زکوٰۃ لینے والا ہی نہ ملتا تھا۔ تفاوتِ رزق کی فطری حالت سوویٹ روس میں بھی قائم ہے اور عہد نبوت میں بھی قائم تھی۔ لیکن آپ کا خلوص اور آپ کا جذبۂ اخوت نہ روس کے تفاوتِ رزق کو اپنا رہا ہے نہ عہد نبوت کی فطری حالت کو واپس لانے کیلئے کوئی آئینی اقدام آپکے پیش نظر۔ صحابہ کا "انفاق" ان کے جذبِ دروں سے پیدا ہوتا تھا اس لئے ایسے شرفا کو قانونی گرفت میں لانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن جس زمانہ میں یہ حال ہوگیا ہو کہ ہر ہندو تاجر اور سرمایہ دار کے ہاں خیراتی فنڈ کی مستقل مد ہے۔ لیکن کوئی مسلمان زمیندار عیش و سرمستی پر صرف بیجا سے فرصت ہی نہیں پاتا۔ اگر آپ نظام ملکیت میں بنیادی تغیرات جیسے ذرائع سے کفرانِ نعمت کرنے والوں کو مفلوج نہ بنادینگے ہرگز قرآن کا منشا پورا نہیں ہوسکتا۔ تفاوتِ رزق اور عہد نبوت کے نام پر خدا کی مرضیات اور اس کے ضوابطِ حیات کو مسخ نہ کیجئے۔ لاشعوری آرزوئیں پوری کرنے کیلئے اور نقاب بھی اوڑھے جاسکتے ہیں۔ آخر عہد نبوت ہی کو کیوں بدنام کیا جائے۔ اگر مساواتِ رزق جرم تھی تو حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کرامؓ کے اختلاف کے باوجود سب کو سرکاری خزانہ سے برابر برابر قومات کیوں تقسیم کیں۔ یا قرآن و حدیث نے حکومت کیلئے مساواتِ رزق کا آرڈر دیا تھا اور عوام کیلئے تفاوتِ رزق کا۔

حضرت عمرؓ نے پارٹی ڈسپلن قائم کرنے اور اقتصادی تضاد کو ٹکراؤ سے دور رکھ سکنے کیلئے ہنگامی طور پر اپنی پالیسی ضرور بدل دی تھی۔ وہ انقلابی پارٹی کو سوویٹ روس کی طرح زیادہ وزن دیتے تھے اور دوسرے لوگوں کو کم۔ لیکن ان کی آرزو بھی یہی رہی کہ ہر شخص کو ایک ہی سطح پر لایا جاسکے۔ آخر حکومت کو مساواتِ رزق کا تصور کہاں سے ملا۔ قرآن نے اپنے کسی پارہ میں بھی حکومت اور عوام کی اقتصادی پالیسی کیلئے الگ الگ نقشے نہیں بنائے۔ اس کا بنیادی نظریہ ایک ہے انفرادیت کیلئے بھی اور اجتماعیت کیلئے بھی، حکومت کے لئے بھی اور عوام کے لئے بھی۔ پھر یہ کیا ہوا کہ خلافتِ راشدہ میں دو مختلف اقتصادی پالیسیاں جاری ہوگئیں۔ حکومت مساواتِ رزق چاہتی تھی اور عوام تفاوتِ رزق۔ کیا آپ بھول گئے کہ تفاوتِ رزق سے جو ناخوشگوار حالات پیدا ہوتے چلے جا رہے تھے ان ہی کو محسوس کرکے حضرت ابوذر غفاریؓ نے عوامی محاذ بنا لیا تھا۔ اگرچہ انھیں بھی سیفٹی ایکٹ کے تحت نظربند ہونا پڑا مگر فکر بلند کو واپس لینے کی عار ونگ گوارا نہ کی گئی۔ اگر حضرت عثمانؓ حضرت ابوذرؓ کی فراست سے فائدہ اٹھاسکتے تو انھیں قتل نہ ہونا پڑتا۔ تضاد اور معاشرتی نفرت طاقتور ہو کر جو شگوفے کھلاتی ہے اس کا پہلے ہی سے اندازہ کرلینا چونکہ سہل چیز نہیں اسلئے حضرت عثمانؓ محسوس نہ فرما سکے۔ اور وہی ہوا جسے قدرت کا اٹل قانون ہمیشہ کے لئے طے کرچکا ہے۔

آپ نے عہد نبوت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ جمع زر سے جو تفاوتِ رزق پیدا ہوتا ہے وہ پیغمبرانہ رہنمائی بھی رکھتا تھا۔

لہٰذا مجھے دریافت کرنے کی اجازت دیجئے کہ تفاوتِ رزق کے اس فطری نظام کو اپنانے کیلئے خود پیغمبر اسلام نے پیشقدمی کیوں نہیں فرمائی وہ صبح کا رزق شام تک اور شام کا رزق صبح تک کیوں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ کیا "العفو" کی تفسیر ان کے نزدیک یہ تھی کہ جو کچھ شام تک بچے اسے تقسیم کر دینا چاہئے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو کیا سنتِ پیغمبر کی وہ تشریح ٹھیک ہوگی جو جمع زر کے ذہن کو سہارا دیتی ہو، یا وہ تشریح جو تقسیم دولت کی ایثار پیشگی کو ترقی دے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا کیرکٹر بہت بلند تھا اور اس لئے عوام کو ان کی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ سہولت دینا پڑتی لیکن اتنی بات تو تسلیم ہی کر لینا چاہئے کہ "عفو" کو تقسیم کر دینے کا مکمل تصور وہی ہے جس پر پیغمبر نے عمل کیا۔ پیغمبرانہ "اسوۂ حسنہ" اگر کوئی قابلِ تقلید چیز ہے اور "انسانی فطرت کے فریم میں اس تصویر کو فٹ" کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر اہلِ سنت کی حکومت قائم کرنے والے وہی راہ کیوں نہیں اختیار کرتے جو پیغمبر اسلام نے مدینہ میں اختیار فرمائی تھی۔ انھوں نے صحابہؓ سے "عفو" طلب کیا اور سب کو یکجا کر کے ضرورتمند صحابہؓ کو برابر تقسیم کر دیا۔ خدا کو تفاوتِ رزق پسند ہے اور اس کا پیغمبر جب تقسیم کرتا ہے تو ہر تفاوت کو مٹاتے ہوئے۔ تعجب ہے کہ محبتِ رسولؐ اور اسوۂ حسنہ کی پیروی تمام ایسے معاملات میں تو بڑے جوش و خروش سے کی جاتی ہے جس کا جمع شدہ سرمایہ پر اثر نہ پڑتا ہو۔ لیکن جب کبھی انفاق، تقسیم دولت اور عوام کے تمدنی معیار کو مساویت کے ساتھ بلند کرنے کی طرف بلایا جاتا ہے تو سنتِ پیغمبر کو فراموش کرنے آئینی گرفت کو غلط کہنے اور اقتصادی جمہوریت کو گناہ بتانے سے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ آخر آپ نے یہ بھی سوچا کہ احبار کے ہاں وراثت کیوں نہیں ہوتی؟ اگر اقتصادی نشیب و فراز اور سرمایہ کی وراثت، خدا کی خوشنودی کا باعث ہے تو پیغمبروں سے زیادہ کسی کو وراثت چھوڑنے کا ذوق نہ ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ وہی اس ذوق سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔ قرآن نے "مما ترکوا" میں حصہ دار ضرور قرار دیئے ہیں لیکن وراثت کیلئے سرمایہ چھوڑ جانے کی کہیں تلقین نہیں کی گئی۔ اگر کوئی اپنی دولت اپنی زندگی ہی میں تقسیم نہیں کر سکا تو خدا اس کمی کو موت پر ضرور پوری کر دینا چاہتا ہے مگر اس حق وراثت کا مقصد وراثتی حقوق کو قیمتی قرار دینا نہیں بلکہ بنیادی مقصد صرف تقسیم سرمایہ ہے اور کچھ نہیں۔ قرآن نے ہزار جگہ بتایا کہ تقسیم زر اور انفاق کے راستہ میں وراثت کے تخیل کو رکاوٹ ہو جانے کا موقعہ نہ دینا چاہئے کیونکہ "نحن الوارثون" ہر سرمایہ کے وارث تو ہم ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس سرمایہ کو تم اپنی آئندہ نسلوں ہی کیلئے مخصوص رکھنا چاہتے ہو وہ مخصوص بھی رہ سکے گا۔ ہندوستان و پاکستان کے کتنے ورثاء اپنے باپ دادا کی جائیداد سے محروم ہو گئے۔ اگر وراثتی تخیل کی گندگی رکاوٹ نہ بن گئی ہوتی تو وہ وراثت جو کسی کے کام بھی نہ آ سکی۔ کتنے بچوں کو صحت مند اور کتنے جوانوں کو تعلیم یافتہ بنا کر مسلم سوسائٹی کو ایک زندہ متحرک اور بیدار قوم میں تبدیل کر سکتی تھی۔ قرآن کا ہر ورق گواہ ہے کہ اس کے فریم میں کہیں بھی وراثت اور ملکیت و اقتدار کی وہم پرستیوں کو وزن نہیں دیا گیا۔ یوں سرمایہ جمع کر لینے کی حد تک نہ پیغمبر اسلام کو اعتراض تھا اور نہ آج سرمایہ داری کے سخت ترین دشمن سوویٹ روس کو رقم پس انداز کرنے والوں سے ذرہ برابر شکایت۔ سوال صرف یہ ہے کہ سرمایہ عوام پر اقتدار حاصل کرنے، انسانوں کو جانور بنانے اور پست و بلند طبقات پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یا فکِّ رقبہ (پھنسی ہوئی گردنوں کو چھڑانے اور آزاد ماحول پیدا کرنے) کیلئے یتیم و مسکین کو پُر جمود زندگی سے متحرک زندگی تک ابھارنے کیلئے اور زیردستوں کے معیارِ زندگی کو زبردستوں کے برابر لانے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر پہلی غرض کیلئے سرمایہ کو تقسیم کیا گیا تھا تو قرآن کے نزدیک ایسے سرمایہ دار معاشی بحران، خسارہ اور تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ انھیں غلط راستے پر جانے سے روکنا حکومت کا فرض ہے خواہ زندگی کی بساط کو پلٹ ہی دینا پڑے۔ قانونِ وراثت و ملکیت کے نام پر قرآن نے کسی کو حق نہیں دیا کہ وہ مسلم سوسائٹی کو بنیادی نصب العین سے بے نیاز ہو جانے کی اجازت دیدے۔ صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں ہرگز ایسا نہیں ہوا کہ وراثت اور ملکیت کو انسانی خدمات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جانے کی اجازت دیدی گئی ہو۔ عہدِ نبوت میں کفرانِ نعمت کی راہ نہیں اختیار کی گئی تھی۔ وہ نعمت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا عہدِ سعادت تھا نہ کہ وہ عہدِ شقاوت، جو نہ بے گور و کفن مہاجرین کی پرواہ کرتا ہے نہ بے جھونپڑی کے کاشتکاروں کا خیال، جو نہ مزدور کے بھوکے بچوں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہے نہ بیماروں کی کراہ اس کے سینہ میں درد کی ٹیس پیدا کرنے کے قابل۔ آج "ملکیت" کو محفوظ رکھنے کی ضرورت

اسلئے نہیں پڑی کہ نجات اخروی کا دروازہ بند ہو جاتا کتنی بداخلاقیاں اور ابلیسانہ حرکات ہیں جو پہلے ہی جنت کے دروازے بند کر چکیں۔ ترحم خسروانہ کی بات الگ رہی ضابطہ میں کوئی جنت کا حقدار معلوم نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ۔ اگر خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا تھی تو مالکانہ حقوق کے علاوہ بھی زندگی کے صدہا پہلو تشنۂ تکمیل ہیں انھیں ہی خدا کی مرضی کے مطابق کیا جاتا۔ یہ کیا کہ فقط مسئلۂ ملکیت کو جھگڑے پر رکھ لیا گیا۔ خصوصاً جبکہ علامہ مودودی کے نزدیک بھی ذرائع پیداوار سے خدا دلچسپی نہیں رکھتا۔ کچھ تو ہے راز، جس کی پردہ داری ہے

اگر کوئی انسانی گروہ نیک عمل نہ رہے تو خدا وراثت کا تحفظ نہیں کرتا۔ چھین لیتا ہے۔

اورثنا ھا قوما آخرین۔ ہم نے تمام قومی سرمایہ کا وارث دوسری قوم کو بنا دیا۔

اور اگر نیک عمل ہو تو اسی گروہ کی طرف وراثت منتقل کر دیتا ہے۔

وتلک الجنۃ التی اورثتموھا بما کنتم تعملون (زخرف) یہ ہے وہ عیش و بہار کی زندگی جسے عملی جدوجہد کے نتیجہ میں تمہاری وراثت بنا دیا گیا۔

اگر خدا کی مستقل پالیسی، عیش و غم کے بارے میں یہی تھی اور وہ ہمیشہ قوم فرعون جیسے ظالموں سے چھین کر پس ماندہ طبقات معاشی طاقتوں اور سہولتوں سے محروم کر دیئے جانے والوں ہی کو واپس کرتا رہا ہے۔ تو آپ خدا کے ابدی قانون کو انسانی سوسائٹی میں نافذ کرنے سے کیوں خوف زدہ ہو رہے ہیں۔ کیا خدا کی دعوت اپنے قانون سعادت و شقاوت کی طرف نہ تھی؟ اگر انکار کرنے کی جرأت نہ ہو تو ایسے مالکانہ حقوق کو قائم رکھنے کی حمایت نہ فرمائیے جو قانونِ شقاوت کو فرصت زیست دے رہے ہوں۔ بدقسمتی سے ہمارے مفکرین کا دل و دماغ عرصہ سے "عدالتی" بن گیا ہے جو تعزیراتِ ہند سے ضمنی مسائل تو پیدا کر سکتا ہے لیکن خود دستور و قانون کی بنیادی صداقتوں پر سوچنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ ورنہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر نہ رہتے کہ معاملات میں شرعی وجوب ہمیشہ حالات کا تابع رہتا ہے۔ بقول حضرت ابن عباسؓ کے کہ پیغمبر اسلام نے مزارعت کا شغل کرنے والوں کو ہدایت کی تھی کہ "ان یرفق بعضھم ببعض" (اگر ایک دوسرے سے نرمی کا برتاؤ کرے) مگر جب اس آرڈر پر عمل نہ کرتے ہوئے فوجداری کی نوبت آنے لگی تو خود پیغمبر اسلام ہی نے فرمادیا کہ "ان کان ھذا شانکم فلا تکروا المزارع (اگر تمہاری یہی حالت ہے تو زمینوں کو کرایہ پر نہ دیا کرو۔

احادیث کے زاویۂ نگاہ سے بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک وقت باہمی خوشگواری کی توقع پر مزارعت کی اجازت دی جا رہی ہے اور توقع پوری نہ ہونے پر ممانعت کا شرعی وجوب نافذ کیا جا رہا ہے اور قرآن کا زاویہ نگاہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ خوشگوار حالات پیدا کرنا ہی کسی معاشی نظام کا بنیادی مقصد ہو سکتا ہے۔ اگر یہی چیز کسی نقشہ سے مٹنے لگے تو اسے بدل دینا ہی سب سے پہلا کام ہونا چاہیئے چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اپنی فکر بلند کے زیر سایہ فرما گئے۔

اگر معاشرہ کے ارتقا میں افراد کا تعامل اس طرز کا ہو کہ اس میں تعاون کو دخل نہ ہو یا ان کی رضامندی حقیقت و معنی کے لحاظ سے ظلم و ناانصافی کا حکم رکھتی ہو تو ایسے معاملات پسندیدہ نہیں ہیں اور نہ ہی وہ معیشت کے اسباب صالحہ سے ہیں بلکہ وہ حکمت مدنیہ (اجتماعی فلسفہ) کے لحاظ سے باطل و حرام ہیں۔

معاشی وسائل کو ذریعۂ معیشت بنانے کی شرط یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی حریت معیشت پر اثر انداز نہ ہو کہ اس سے تمدن انسانی میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ (مزارعت پر تحقیقی نظر۔ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۰ء)

آج کی زمینداری، جاگیرداری اور کارخانہ داری کیا شاہ صاحبؒ کے زاویۂ نگاہ سے تمدنی زندگی کو فاسد کرنے والی چیزوں میں شمار نہیں کی جا سکتی۔ کیا اس نظامِ ملکیت میں مزدور و کاشتکار کی حریتِ معیشت قائم ہے۔ کیا مزدور و کاشتکار کی وہ رضامندی جس کا بہت چرچا ہے کھلی ہوئی ظلم و بے انصافی کا نتیجہ نہیں اور کیا ان حالات میں شرعی وجوب و عدم وجوب کی نوعیت وہی رہے گی جو عہدِ نبوت میں تھی۔ کیا دونوں سوسائٹیوں کا معیاری اخلاق، طرزِ زندگی اور بیدار احساس یکساں ہے۔ اگر دونوں میں زبردست تفاوت ہے تو پیداواری نظام کی نئی بساط بچھانے کو کیونکر حرام کہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور کیونکر

عہد صحابہؓ کے نام پر ظلم و ناانصافی کو جاری رکھنا جائز ہوگا۔

مولانائے محترم نے اپنے مورچہ کو مضبوط بنانے کیلئے ان حضرات پر بھی نکتہ چینی فرمائی ہے جو قرآن سے یہ ثابت کر رہے تھے کہ سرمایہ داروں کا اخلاقی اور آئینی فرض یہ ہے کہ کم از کم اپنے زیر دستوں کو اس تمدنی معیار تک بلند کرنے کیلئے اپنی دولت تقسیم کرتے رہیں جس پر خود کھڑے ہیں تاکہ تمدنی ناہمواریوں سے باہمی نفرت، بداخلاقی اور دماغی الجھنیں پیدا ہو کر تباہی کا راستہ ہموار نہ کرنے لگیں اور اسی انداز تحریر کے سایہ میں نکتہ چینی کا فرض انجام دیا گیا ہے جو ان کی طعنہ باز فطرت کا جزو بن چکا۔

> مارکس کے مومنین مارکسزم کیلئے جب قرآن کی آیات کی جراحی کرنے لگتے ہیں تو مساواتِ ملکیت کا غیر فطری اصول وہ سورۂ نحل کی ایک آیت سے اخذ کر کے دکھاتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کی تاویل بازی اتنی احمقانہ ہوتی ہے کہ آدمی سر پیٹ کے رہ جاتا ہے۔ جس آیت کو ہدف بنائیں گے اسے پورے سلسلہ بیان سے اس طرح کاٹ کر الگ کر لیں گے جس طرح ایک جسم نامی سے کوئی عضو قطع کر کے الگ رکھ لیا جائے پھر اس عضو پر ساری بحثیں ہوں گی اور جس جانور سے چاہیں گے اس کا جوڑ ثابت کر دینگے۔ ان کی بلا جانے کہ سورۂ نحل کا پورا سلسلۂ مضمون اور عمودِ بحث کیا ہے۔ ان کی سات پشتوں میں کسی نے اس سورت کو سمجھ کر اور اس کے ربطِ مطالب کو ذہن نشین کر کے مطالعہ نہ کیا ہوگا۔

اگر اسلامی جماعت کے مفکرین کا اسلامی ادب یہی ہے تو اسے خوش ہونا چاہیئے کہ وہ تبرا بازی کے نئے نئے ڈھنگ پیدا کرنے میں اس سیاسی تضاد سے بھی بازی لے گئی جسے فرقۂ شیعہ کا نام دیا جاتا ہے۔ آپ بدِ مقابل کی سات پشتوں کا اس طرح تذکرہ فرما رہے ہیں گویا کہ جناب کے خاندان میں سات پشتوں سے مجتہدین امت ہی پیدا ہوتے آئے تھے اور کبھی ایسا اتفاق ہی نہیں ہوا کہ آپ کی خاندانی تاریخ مفسرین، محدثین، فقہا اور مفکرین اسلام کے شاہکاروں سے خالی رہی ہو۔ مولانا اس قسم کے رکیک حملے کرنے سے پہلے ذرا اپنے خاندانی پس منظر کو بھی سامنے رکھا کیجئے تاکہ ایسی باتیں کہنے کی آپ کو جرأت نہ ہو سکے۔

زاویۂ نگاہ کا اختلاف جرم نہیں۔ لیکن فریب کارانہ طور پر سچائیوں کا چہرہ بگاڑ دینا خدا کو کبھی پسند نہیں آسکتا۔ آپ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمالیں گے کہ جس آیت کو نعیم صاحب کی نیازمندی سے انکار کرنے والوں نے پیش کیا تھا اس میں مارکسزم کا ہلکا رنگ بھی نہ تھا۔ مارکس کے معتقدین کسی کو معاشی برتری سپرد کر کے اس سے تقسیم دولت کا مطالبہ کرنا ہی غلط سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ جن لوگوں کو محنت کاروں کے خون و پسینہ سے اقتصادی برتری حاصل ہو گئی ہے وہ محنت کی قدر کو محنت کرنیوالوں کی طرف واپس نہیں کرتے۔ اپنے تمدنی معیار کے برابر کرنے کیلئے۔ حالانکہ یہ طرزِ عمل، دولت مندی کے ٹھوس تقاضوں کا انکار ہے جس کا نتیجہ قرآن ہی کی تفصیلات کے مطابق ہمیشہ تباہ کن نکلتا رہا۔

کیا یہ دونوں تصور بنیادی طور پر ایک ہیں۔ ایک طرف قرآن ہے جو دولت مندی کو عوام کے روز و شب خوشگوار بنانے کی ہدایت کرتا ہے تاریخی نتائج سے بچ سکنے کیلئے دوسری طرف مارکس ہے جو دولت مندی کو پیدا ہونے سے پہلے ہی دفن کر دینا چاہتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ مارکس کے نظریات قرآنی فکر پر عمل نہ کرنے کا ردِ عمل ہے اور ان لوگوں کی تباہی کا زینہ جو تقسیم دولت کے قرآنی نظام پر عمل نہ کر کے بھی بہتر نتائج کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن بہر حال کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں نظریات میں یگانگت ہے۔ اگر اس کے باوجود "مارکسی مومن" کا زہر آلود نشتر چبھویا جا رہا ہے تو قدرت کے انتقام سے بے خبر نہ رہنا چاہیئے۔ حدود شکن پارٹیوں کا ہمیشہ جو حشر ہوتا رہا اسی کا آپ کو بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ پست و تاریک لٹریچر کا نام اسلامی ادب رکھنا اسلام اور اس کے پاکیزہ ذہن کی توہین ہے۔ جو پیغمبر اسلام کافروں کو بھی ذلیل کرنا پسند نہ کرتا تھا اس کی سنت مطہرہ کے متبعین مسلمانوں کی توہین کر کے اپنے جذباتِ نفرت کی تسکین کر رہے ہیں۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

دشنام طرازی کی مشق کرنے کے بعد مولانائے موصوف اسی دعوے کو دہراتے ہیں جسے پچھلی آیت کے سلسلہ میں پیش کیا گیا تھا۔ یعنی

سورۂ نحل مرکزی مفہوم کے لحاظ سے معاشی مسائل سے بحث نہیں کرتی (اگرچہ اس میں بعض مواقع پر معاشی مسائل کیلئے اشارات ملتے ہیں) بلکہ خدا تعالیٰ کی ربوبیت والٰہیت کی توحید کا اثبات مظاہر کائنات سے کرکے دکھانا اس کا عمود کلام ہے اور اس موضوع کے لحاظ سے وہ مشرکین مکہ کے نظریات و مسلک کی تردید کرتی ہے۔

غالباً قرآنی سورتوں کے مرکزی مفہوم کو معاشی نہ بتانا مولانائے محترم کا "تکیہ کلام" بن گیا ہے۔ اگر یہی طرزِ فکر رہا تو وہ دن دور نہیں جبکہ مولانا یہ بھی دعویٰ کرنے لگیں گے کہ قرآن دنیاوی معاملات سے بحث ہی نہیں کرتا۔ اس کی تمام تر معلومات عالم آخرت سے وابستہ ہیں۔ یہ بات الگ رہی کہ "بعض مواقع پر معاشی مسائل کیلئے بھی اشارات ملتے ہیں"۔ اس طرح مولانا کی اسلامی فکر اور دوسرے مفکرین مذاہب کے عقائد و خیالات مرکزی طور پر ایک ہی تصویر کے دو رخ ہو جائیں گے اور وہ دن محاذ متعین کرنے کیلئے بڑا مبارک دن ہوگا۔

مولانا مارکسی مومنین کی جس آیت پر نکتہ چینی کر رہے تھے اس کا سیاق و سباق پیش کرنے کیلئے یہ کافی تھا کہ چند آیات اگلی اور پچھلی نقل کر دی جاتیں۔ لیکن مولانا جیسے فن کار ادیب سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ کسی بات کو الجھانے کا آسان راستہ تھکا دینے والی طوالت کے سوا کوئی نہیں۔ مسلمان عام طور پر گہرے مطالعہ کی عادت نہیں رکھتے۔ خصوصاً مذہب پر سوچنے کو تو انھوں نے سالہا سال سے خوف زدہ ہو کر حرام ہی کر رکھا ہے۔ ایسی حالت میں کسی اسلامی ادیب کا "بھول بھلیاں" میں پھنسا کر چھوڑ دینا مسلمانوں کو جہاں تک سراندار ہونے پر مجبور کر سکتا ہے اس کا بسہولت اندازہ کیا جا سکے گا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ مناسب یہ ہوتا کہ آیت مذکورہ کا سیاق و سباق دکھاتے ہوئے پورے قرآن کا عمود کلام بھی بتا دیا جاتا۔ "والحمد" سے لیکر "والناس" تک تمام سورتیں نقل کرکے۔ تاکہ اسلامی جماعت کے زاویۂ نگاہ سے انکار کرنے والوں کو "چھٹی کا دودھ" یاد آجاتا۔ اجتماعی نفسیات کا علم تجارت کیلئے تو مفید ثابت ہو چکا اب اگر پارٹی اقتدار کیلئے اسے مذہب کے نام پر اسلامی جماعت والے استعمال کر رہے ہیں تو اس کی داد دینا چاہئے، ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

بہرحال ہم مولانا کی ادیبانہ فن کاریوں کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے ان کی طویل عبارت جہاں تک ہو سکے نقل کرنے اجازت چاہتے ہیں۔ تاکہ کسی نئی مغالطہ آفرینی کا موقعہ نہ مل سکے۔ ارشادِ گرامی ہے:

یہی سلسلۂ کلام (یعنی خدا اور بتوں کی مختلف نوعیتوں پر سوچنے کی قوتوں سے کام لینا۔ ابوالنظر) جب شباب پر آتا ہے تو اس موقع پر مثبت دعوت سامنے رکھی جاتی ہے جس کی طرف بلانا سورت کا اصل مقصد ہے ——— دعوت یہ ہوئی کہ ایک سے زائد "الٰہ" نہ تسلیم کرو۔ اللہ تو ایک ہی اللہ ہے۔ پس مجھ ہی سے ڈرو، اسی کی ملکیت میں ہیں، زمین و آسمان کی ساری موجودات اور اس ہی کا عدل دوامی ہے۔ تو پھر اللہ کے سوا آخر تم کو اور کس کے جبروت سے خوف و مرعوبیت لاحق ہے۔

اس کے بعد حسب ذیل باتیں ایک تسلسل سے آتی ہیں:

(ا) تمہارے قبضہ میں جو کچھ نعمتیں ہیں سب اللہ کی عطا کردہ ہیں اور جب تم کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو اسی کے حضور فریادی ہوتے ہو۔

(ب) پھر جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریکِ ربوبیت والٰہیت بنانے لگتے ہو۔

(ج) اور ان کیلئے آسمانی علم سے آزاد ہو کر اپنی روزی میں سے نذرانے ٹھہراتے ہو۔

(د) خود بیٹیوں سے نفرت کرتے ہو اور اللہ کے لئے فرشتوں کو بیٹیاں قرار دیتے ہو۔

(س) اس معاملہ میں اصلاح کیلئے ہم نے ہمیشہ رسول بھیجے لیکن وہ شیطان کی خوش خیالیوں ہی میں مگن رہے۔

(س) تمہارے لئے چوپایوں میں نشاناتِ عبرت ہیں جن کے بدن میں لہو اور گوبر بننے کے ساتھ ساتھ تمہاری مرغوب غذا دودھ بنتا ہے۔

پھر کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں میں سامانِ بصیرت ہے جن سے ضروریات بناتے ہو پھر خدا ہی نے شہد کی مکھی کو وحی کے ذریعہ یہ بصیرت دی ہے کہ وہ چھتہ بناتی ہے اور رنگا رنگ شہد کو پھول پھول کے رس سے جمع کرتی ہے۔

پھر وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں خلق کیا اور پھر تم میں سے بعض پر جوانی میں اور بعض پر ارذلِ عمر میں داخل کرنے کے بعد موت وارد کرے گا۔

(اب اس سلسلۂ کلام میں مارکسی حضرات کی آیتِ مساوات آتی ہے)

(ص) اور اللہ ہی نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں فضیلت دی ہے۔ تو پھر جن کو فضیلت دی گئی ہے وہ اس بات پر ہرگز آمادہ نہیں ہو سکتے کہ اپنے مملوکہ رزق کو اپنے غلاموں کے حوالے کر دیں اور اس طرح باہم برابر ہو جائیں ——— پھر کیا وہ اللہ کی نعمتِ رزق کے منکر ہیں؟

ذرا غور فرمائیے کہ اوپر کے سلسلہ کلام کی مناسبت سے موضوع سے نکلتا ہوا مفہوم اس موقع پر کیا اخذ ہوتا ہے۔

صرف یہ کہ جیسے آقا اپنے غلام کو اپنا شریک نہیں ٹھہرا سکتا اور اپنی املاک کا اُسے مساویانہ مالک نہیں بنا سکتا بالکل اسی طرح اگر یہ مشرکین ذرا غور کریں تو انسانی زندگی کے ان مظاہر سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے کسی مخلوق و مملوک کو اپنی خدائی اور اپنی مملوقات کی ملکیت اور اپنے حقوق و اختیارات میں شریک بنانے پر تیار نہیں ہے۔ جس بات پر وہ اپنے لئے معمول بنائے ہوئے ہیں اللہ کیلئے یہ اسی کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔

"اللہ کی نعمتِ رزق سے کیا وہ منکر ہیں" کے ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ اپنی مقبوضہ نعمتِ رزق کے بارے میں مالکانہ دعوے سے دست بردار ہو سکتے ہیں اور اپنے املاک سے انکار کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارا نہیں ہے؟ اگر وہ اپنے املاک (جو اللہ کی نعمت ہیں) کی ملکیت (خود یہ ملکیت کا حق بھی نعمتِ الٰہی ہے) کے دعوے پر جمے رہتے ہیں اور اسے دوسروں سے تسلیم کراتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور املاک کے بارے میں ملکیت بلا شرکتِ غیرے کے دعوے سے دست بردار ہو جائے۔

گویا یہاں انسانی زندگی سے ایک مثال لیکر اس سے استدلال کیا گیا ہے لیکن مثال یہی ایک نہیں لی۔ آگے دو اور مثالیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ ان کو بھی ملاحظہ کیجئے کہ تینوں سے مجموعی طور پر نتیجہ کیا اخذ ہوتا ہے۔

(اگلی مثالوں میں سے ایک مجبور غلام اور آزاد انسان کی ہے۔ اور دوسری اپنی ذمہ داری نہ نبھا سکنے والے گونگے ناکارہ بلکہ کام بگاڑ دینے والے شخص کے مقابل پر اس شخص کی جو متوازن زندگی بسر کرنے اور راہِ راست پر چلنے والے کی۔ ابوالنظر)

یہ تینوں مثالیں براہِ راست توحید و شرک کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں جو پوری سورۂ نحل کا مرکزی موضوع اور عمود ہے۔

ان مثالوں کے بعد پھر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر تسلسل سے چلتا ہے اور آگے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے کفر، ظلم اور شرک کی راہ چلنے والوں کو انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ یہ وہ موقع ہے جہاں بات "ویوم نبعث من کل امۃ شھیداً" سے شروع ہوتی ہے اور جہاں واذا رأ الذین اشرکوا شرکاء ھم کہہ کر مشرکین مکہ کو خاص تنبیہ کی جاتی ہے۔

پھر یہ حضرات نہیں سوچتے کہ جب نعمتوں کا سلسلہ بیان چل رہا ہو تو اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلتِ رزق دی ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ ایک قابلِ شکر مقام ہے، نہ کہ تذکرہ کسی مفسدہ کا ہے۔

یہ ہے وہ طرزِ فکر جسے اختراعی ذہن کا شاہکار سمجھتے ہوئے ان مسلمانوں کو جو تقلیدی ذہن رکھنے والے علماء کے اشاروں پر چل رہے ہیں، اُس سمت موڑ جانے کا وعظ دیا جا رہا ہے جدھر مغربی تہذیب کی عمارت کو شکست کر دینے والے "مجاہد فلسفی" کھڑے ہیں۔

کیا کوئی شخص بھی کہہ سکتا ہے کہ ان تمام تفصیلات میں کوئی ایک علمی نکتہ، کوئی اجتہادی پہلو اور کوئی ایسی روشنی دریافتی بھی ہے جو ہمارے فرسودہ خیالات رکھنے والے علماء مقلدین کے مکاتب میں پڑھنے والے معمولی طالب علم بھی نہ جانتے ہوں۔ اگر فکر و نگاہ کی تابناکی اسی کا نام تھا۔ تو تاریکی اور فضا کا دھندلکا کسے کہتے ہیں۔ قرآن کا گہرا مطالعہ کرنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی مگر چونکہ بچپن سے فقرہ بازی کی عادت ہو گئی تھی۔ اس لئے مخالف کی سات پشتوں کو بھی معاف نہیں کر سکتے۔ اس بلندیٔ فکر پر یہ خُلقِ عظیم، خدا کی ایک ایسی نعمت ہے جس پر ہمیشہ اسلامی جماعت ناز کرتی رہے گی۔

میں قبل اس کے کہ اس سورت کے محورِ فکر پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ مولانا کی تفسیر کا کیمیاوی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ دونوں رخ سامنے رکھنے کیلئے اس کی ضرورت تھی، امید ہے کہ علمی سنجیدگی کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیا جائے گا۔

مولانا کا خیال یہ ہے کہ سورۂ نحل نازل کرنے کا مدعا صرف اتنا تھا کہ توحید کا دعویٰ کیا جائے، شرک کے مذہبی عقیدہ سے منع کیا جائے اور حکومتِ الٰہیہ سے خوفزدہ۔ مگر کس طرح، توحید اور خدا کی طاقت کا تاریخی زندگی میں یقین نہ پیدا کر سکنے کے باوجود چند سادہ نفسیاتی مگر نیم شعوری دلائل کے بھروسہ پر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ "بتِ سنگین" نہ سہی تاریخی قوت ہی کام کر رہی ہو۔ خدا تو بقول مولانا کے بعد از قیامت ہی کچھ کر سکے گا۔ مگر خدا دشمن اشتراکیوں کے نزدیک تو تاریخی طاقت ناکارہ نہیں ایک زندہ طاقت ہے۔ وہ ماضی میں بھی قوموں کو اپنی راہ پر چلاتی رہی، آج بھی اپنی سمت سے دور تک نہیں جانے دے رہی اور مستقبل میں بھی کوئی انسانی طاقت اس کا راستہ نہ روک سکے گی۔ سماجی شعور کے بغیر جو طاقت انسانی تمدن کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہو اس کا مقابلہ کوئی کس طرح کر سکتا ہے۔ کل تک جو پہلو خدا کی طرف منسوب کئے جاتے تھے آج تاریخی طاقت میں بتائے جا رہے ہیں۔ پچھلے زمانہ کا بُت خدا کا سفارشی ہوتا تھا۔ آج اس سے بھی بے نیازی ہو گئی۔ بت پرستی کے مقابلہ پر جو دلائل کارگر ہو سکتے تھے، مولانا کا خیال ہوگا کہ شاید وہی دلائل اُسی انداز سے آج بھی نتیجہ خیز ہو سکیں گے۔ کاش مولانا کو خبر ہوتی کہ "دل کی دنیا بدل گئی ساری"۔ اب انسانی شعور اس کے نفسیاتی رجحانات اور اس کے عملی پروگرام پچھلے دور سے بالکل مختلف ہو چکے۔ آج کا ذہن خدا دشمن ہونے پر بھی بت پرستی کو لعنت اور انسانیت کی توہین یقین کرتا ہے۔ جس شرک سے آپ بچاتے رہے تھے اسے تو کارخانۂ حیات کی گردشوں ہی نے "سرمۂ چشمِ بصیرت" بنا دیا۔ خدا دعویٰ ہی نہیں کرتا۔ اس کی تخلیقی قوتیں "آٹومیٹک" طور پر دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کام بھی کرتی رہتی ہیں۔ کائنات کی تعمیر حق پر ہوئی تھی، باطل پر نہیں۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا (اے ہماری زندگی کو نشو و نما دینے والے تو نے یہ سب کچھ منفی پہلو پر نہیں پیدا کیا تھا۔)

آج توحید اور شرک کا جو سائنٹفک اور تمدنی ذہن ہے اس کا جواب قرآن کے پاس جو کچھ ہو وہ پیش کرنا چاہئے نہ کہ قدیم توہم پرستوں کے تاریک خیالات کا جواب۔ مولانا یہ تو بڑی بے ساختگی سے ترجمہ کر دیتے ہیں کہ ساری موجودات، خدا کی ملکیت میں ہیں اور اسی کا عدل دوامی ہے مگر غیر خدا سے خوف زدہ نہ ہونے کی بنیاد، صرف حیاتِ آخرت سے اٹھائی جاتی ہے۔ جو بدنصیب خدا کے سوا دوسری طاقتوں سے ڈر رہا ہے وہ صرف دنیاوی مفادات حاصل کر سکنے کی خاطر۔ اگر کسی خدا کا عدلِ دوامی اور اس کا اقتدار دنیاوی زندگی تک زنگ آلودہ ہی رہتا ہو تو ایسے خدا کو ماننے سے کسی بہادر کا کیا فائدہ؟ خدا کا یہ کہنا کہ بُت ناکارہ، گونگے اور ہر کام کو بگاڑنے والے ہی ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ خدا آزاد ہے اور دوسری طاقتیں محکوم۔ اس حالت میں کیسے ثابت ہو سکے گا جبکہ آخری سانس تک کسی آدمی کو خدا کے گونگے، ناکارہ اور کام بگاڑنے والی ہستی نہ ہونے کا یقین پیدا کرنے کے ذرائع ہی مہیا نہ ہو سکتے ہوں۔

نہ معلوم مولانا کے دماغ میں یہ بات کس طرح اور کون سے وقت پیدا ہوئی تھی کہ توحید، شرک، حکومتِ الٰہیہ اور دوامی عدل کے عقائد معاشی

زندگی سے تعلق ہی نہیں رکھتے" اور ان کا ہماری موجودہ زندگی سے کچھ واسطہ ہی نہیں حالانکہ اگر واقعی ایسا ہوتا تو ساری موجودات پر قابو یافتہ ہونے کے ساتھ "لہ الدین واصبا" (ہر فیصلہ خدا کا فیصلہ ہوتا ہے) کا چیلنج نہ دیا جاتا۔ مولانا کو چونکہ یقین نہیں کہ زندگی میں جتنے فیصلہ کن مرحلے آتے ہیں وہ سب خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ وہ اس کائنات کا اقتدار شیطانی طاقت کو سپرد کر چکے اسلئے ترجمہ ہی بدل دیا گیا۔ کہاں دین و فیصلہ، کہاں عدل۔ عدل و انصاف فیصلہ کی ایک صفت ہے فیصلہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کا عدل دوامی ہو یا ہنگامی، کسی پارٹی کو اپنی سمت بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ قرآن نے حکومتِ الٰہیہ اور ہر فیصلہ کو اپنی جانب منسوب کرتے ہوئے اسی لئے دریافت کیا تھا؟ افغیر اللہ تتقون (کیا خدا کے سوا کسی دوسرے سے ڈرتے ہو)

اگر کوئی اقتدار اتنا زبردست ہے کہ کوئی فیصلہ اس کی منشاء کے خلاف نہ ہو سکتا ہو تو مجھے اپنے مفاد پرستانہ رجحان کا رُخ بھی ادھر ہی کر دینا پڑے گا۔ جب کسی دوسرے جج کا فیصلہ مجھے فتحمند نہیں بنا سکتا تو میں کسی دوسری کچہری کی طرف ایک قدم اٹھانا بھی پسند نہیں کرونگا۔ انسانی فطرت فیصلہ کن طاقت کا غلام ہونا چاہتی ہے۔ اطاعت کبھی عدل کی نہیں ہوتی، فیصلہ اور طاقت کی ہوتی ہے۔ فیصلہ کا منصفانہ ہونا ہماری کوشش میں اضافہ کر سکتا ہے، غلام بن جانے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ خوف بھی اسی طاقت کے زیرِ سایہ آجانے پر دور ہو سکے گا۔ جس کے سوا کسی کا فیصلہ نتائج کا رخ نہ بدل سکے۔ مولانا کی بے یقینی نے جو "روپ دھارن" کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید سیدھے سادے عوام نہ پہچان سکیں۔ مگر جو شخص بے یقینی کے نئے نئے سانچوں سے دھوکہ نہ کھاتا ہوا سے غلط فہمی میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا نے "اللہ کی نعمتِ رزق سے کیا وہ منکر ہیں؟" کی جو عجیب و غریب تفسیر فرمائی ہے۔ اور خالص تقلیدی ذہن کے زیرِ اثر۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے پیش کرنے کی کیونکر ہمت ہو سکی۔ مکھی پر مکھی مارتے جانا ہی اگر تہذیبی انقلاب پیدا کرنے کیلئے کافی تھا تو آخر اسلامی جماعت نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہی کیوں بنائی۔ کیوں جمعیۃ العلماء میں شریک ہو کر پرانے نظامِ فکر و عمل کی حُدی خوانی کو تیز تر نہ کر دیا گیا۔ جس کا سارا تانا روپود ہی ہے جس سے آپ "قبائے زریں" تیار فرما رہے ہیں۔

آیت کا ترجمہ ان ہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے ہے۔ انصاف و دیانتداری کے ساتھ سوچئے کہ کسی عربی لغت، کسی محاورہ، کسی شرعی اصطلاح صرف و نحو اور علمِ بلاغت کی کسی بنیاد پر یہ معنی کئے جا سکتے ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ اپنی مقبوضہ نعمتِ رزق کے بارے میں مالکانہ دعوے سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ اور نہ اپنے املاک سے انکار کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارا نہیں ہے؟

نعیم صاحب صدیقی اچھی طرح جانتے ہیں کہ انکارِ نعمت کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ جو شخص یہ جانتا ہو کہ

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلتِ رزق دی ہے یعنی رکھتا ہے کہ یہ ایک قابلِ شکر مقام ہے۔

کیا وہ شکرِ نعمت کے ساتھ انکارِ نعمت کو نہ سمجھ سکتا ہوگا۔ شکرِ نعمت کیا ہے۔ خدا نے جن سہولتوں سے کسی کو نوازا ہو، اس کا فرض ہے کہ خدا کی نعمت کا تقاضہ پورا کرتے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے سہولت حاصل کرنے کا موقعہ دے۔ شکر چند بے جان الفاظ دہرا دینے کا نام نہیں۔ جس کے ذریعہ نعمت پانے والا ادائیگی حقوق کی ذمہ داریوں سے نجات پا سکے۔ اگر نعمتِ رزق کا شکر ادا کرنا، مولانا کے نزدیک بھی ضروری ہے اور اس مقام کا تقاضہ جو خدا نے کسی کو دیدیا ہے۔ تو پھر انکارِ نعمت کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو انسانی خدمات کے لئے کام میں لانے سے انکار کر دیا جائے۔ آیت بھی صرف اتنی ہی بات کہہ رہی تھی کہ اہلِ فضل و اہلِ دولت کو شکرِ نعمت ادا کرتے ہوئے ماتحتوں کو بھی اس تمدنی آسائش تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ جس پر خدا نے انھیں پہنچا دیا ہے۔ اور جو اُن کی تخلیقی طاقت اور قانونِ پروردگاری کا نتیجہ نہیں بلکہ خدائے یگانہ کی

نوازش ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر حسب عادت تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ تم شکرِ نعمت بجالانے کی جگہ انکارِ نعمت کرنا چاہتے ہو۔

مولانا یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی، حقیقت کا چہرہ بگاڑنے کے لئے سیاق وسباق کا نقاب اوڑھنا چاہتے ہیں۔ کیا سیاق وسباق کو فقرے کا مفہوم ہی مسخ کر دینے کا حق ہے۔ آیت کے اس حصہ میں آخر وہ کونسا لفظ ہے جس کے معنی "مالکانہ دعوے سے دست بردار اور اپنے املاک سے انکار" کے لئے جاسکتے ہیں۔ کیا خدا کی نعمت، سرمایہ داروں کی ملکیت میں داخل ہو کر خدا کی نعمت نہیں رہتی۔ اور سرتاپا سرمایہ دار کی خالص ملکیت بن جاتی ہے۔ اگر خدا کی نعمت کا کسی کی ملکیت میں آجانا نعمت الٰہی ہونے کے امتیازی نشان کو نہیں مٹا سکتا۔ بلکہ خدا کی نعمت ہونا ہی اتنی اہم چیز ہے کہ ہر انسانی ملکیت بھی اس کے سامنے صفر ہو کر رہ جائے تو پھر مولانا کو کیسے جرأت ہو گئی کہ ایسی مجرمانہ ذہنیت کی نمائش کریں۔ سیاق وسباق صرف تسلسلِ فکر قائم کرنے کا کام دیتا ہے۔ فقروں کے خود ساختہ معانی بنا لینے کا نہیں۔ عوام کی قرآنی ناواقفیت سے سیاسی فائدہ ضرور اٹھایئے مگر نہ اس حد تک کہ خود قرآن ہی کی عظمت پر حرف آنے لگے۔ اگر حق ملکیت بھی خدا کی نعمت تھا تو آپ کو نعمت کی جگہ ملکیت کا لفظ کیوں رکھنا پڑا۔ کیا یہاں نعمت کے معنی ملکیت کے تھے۔ اگر "تعلیم کتاب" دیتے ہوئے پیغمبر اسلام نے کسی حدیث میں یہ معنی بیان فرمائے ہوں تو اس حدیث شریف کو تحریر فرمایئے ورنہ ایسی تفسیر بالرائے سے توبہ کیجئے جو نہ پیغمبرانہ تفسیر ہے، نہ علماء متقدمین کی اور نہ انسانی علم وشعور ہی اُسے برداشت کر سکتے ہیں۔

مولانا کی تفسیر کا دراصل مدعا یہ ہے کہ اگر سرمایہ دار، ماتحتوں کو اپنی سطح تک اٹھانے کیلئے اپنا سرمایہ خرچ نہیں کرتے تو کیا حرج ہے؟ دوسروں کو اپنے برابر کرنے کیلئے روپیہ خرچ کرنا اپنی ملکیت سے انکار ہے اور اپنی چیز کو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ میری نہیں۔ چنانچہ دیکھ لو، خود اللہ میاں کا حال بھی یہی ہے وہ بھی اپنی چیز اپنے ماتحتوں کو نہیں دیتے۔ اگر خدا دوسروں کو اپنے حقوقِ ملکیت دینے لگے تو دوسرے بھی برابر کے شریک ہو جائیں گے اور انھیں شرکت پسند نہیں

تقسیم ہند زندہ باد

مطلب یہ ہوا کہ جب سرمایہ دار اپنے ذہن وکردار کو نامناسب خیال نہیں کرتے، تو انھیں خدا کے سرمایہ دارانہ ذہن سے بھی اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ لہٰذا سرمایہ داروں کو چاہئے کہ نہ اپنا شریک پیدا ہونے دیں نہ خدا کا شریک بنائیں۔ پہلی چیز سے مادی زندگی کا عیش نصیب ہوگا اور دوسری چیز سے آخرت کا عیش۔ خدا اور سرمایہ دار کے درمیان مفاہمت کی یہ مثال، انسانیت کی پوری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

مگر سب سے پُر لطف چیز یہ ہے کہ جو بات کہی گئی ہے وہ بھی عجیب طریقہ پر۔ اگر خدا اپنے حقوقِ ملکیت اپنی مخلوق کی طرف منتقل ہی نہیں کرتا تو مالکانہ حقوق کی بحث ہی کیوں ہے؟ آخر بتوں سے کون سے مالکانہ حقوق منسوب کئے جا رہے تھے اور آدمیوں کو کون سے دیئے گئے۔ ان دونوں میں حق تصرف کے لحاظ سے کیا فرق تھا؟ کیا بُت کسی پابندی کو گوارا نہیں کر رہے تھے اور سرمایہ داروں نے ان پابندیوں پر عمل کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ علاوہ ازیں بتوں کی پرستش تو "الی اللہ زلفیٰ" (خدا کی قربت حاصل کرسکنے) کیلئے کی جاتی تھی۔ حق ملکیت کا اس سے کیا تعلق؟ کونسی وراثت تقسیم کی جا رہی یا تبادلۂ جائیداد ہو رہا تھا کہ "مخلوقات کی ملکیت" میں شریک کرنے نہ کرنے کا سوال چھڑ گیا۔ پھر یہ کیسے معلوم ہو کہ واقعی کسی فقہی حیلہ کے ذریعہ بت مخلوقات کی ملکیت میں شریک نہیں ہو سکے۔ بت باطل کو ترقی دینا چاہتے تھے اور خدا حق کا آوازہ بلند کرنا چاہتا تھا۔ اسلامی جماعت کو کھلے طور پر اقرار ہے کہ برابر باطل ہی ترقی کر رہا ہے۔ اس کے کیا معنی ہوئے؟ بتوں کی مرضی پوری ہو گئی مگر خدا کو روزِ قیامت کا انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

مولانا کے طرزِ فکر پر سرسری نگاہ ڈال چکنے کے بعد میں سورۂ نحل کے مرکزی مفہوم پر بھی کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ مطالعہ کرنے والے، دوسرے پہلو سے بھی آشنا ہو سکیں۔

سب سے پہلے انسانیت کے معاشی ذہن کا وہ تاریخی پس منظر سامنے رکھ لیجئے جس کے درمیان سورۂ نحل کا عمود کلام اور محورِ فکر تیار ہوا تھا۔

پیغمبرانِ مذاہب نے جب کبھی تاریخی موڑ پر کھڑے ہو کر خدا کی یگانہ طاقت اور اٹل قانون کے نام پر اپنے معاشی نظام کی طرف دعوت دی۔ مشرق و مغرب کی تمام قوموں نے ہمیشہ ان کے دعووں کو چیلنج کیا۔ کیونکہ جب تک فیصلہ کن طریقہ پر یہ نہ معلوم ہو جائے کہ جس خدا کی دہلیز پر سجدہ کرنے کیلئے بلایا جا رہا ہے وہ عیش و غم کے خدوخال میں رنگ بھرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اس وقت تک بے خطر انسان جھکنے کے لئے تیار نہ تھا جو خدائی زندگی پر قابو یافتہ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اسے موجودہ زندگی پر بھی قابو یافتہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ ناقابل مشاہدہ خطرناکیوں سے خوف زدہ کرنے والوں میں سے کون سے خدا کو سچا اور کسے جھوٹا خدا کہا جا سکے گا۔ جھوٹ اور سچ کا اگر کوئی زندہ معیار ہے تو وہ موجودہ زندگی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا عذاب دینے والے خدا کو پہلے یہاں عذاب دے کر دکھانا چاہیئے۔

فأتنا بما تعدنا — اے نوحؑ تم نے جس عذاب سے ڈرایا ہے اُسے سامنے لاؤ

اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم (انفال)

اے اللہ اگر یہی چیز تیرے نزدیک ٹھوس واقعہ ہے اور ناقابل انکار تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھراؤ کر یا کوئی دوسری دردناک مصیبت میں مبتلا کر دے۔

اگر پیغمبروں کا نظامِ حیات اُس خدا کی طرف سے ہوگا جو طاقتور ہے تو وہ ضرور اپنے دشمنوں کو تباہ بھی کر سکتا ہوگا۔ اس لئے پیغام کے حق و باطل ہونے کا فیصلہ تباہ کن انقلاب ہی کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ انسانیت کا یہ مطالبہ خواہ انسانیت کے راستہ کو طویل اور خطرناک بنا سکتا ہو۔ لیکن تجربہ کرا دینے کیلئے منظور کر لیا۔ خدا کے نزدیک بھی غلط نہ تھا۔

پیغمبرانہ تاریخ میں آپ جتنی قوموں کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں وہ پیغمبروں کی ناکامی نہیں کامیابی کی دلیل ہیں۔ فیصلہ کن طاقت کا ثبوت عملی زندگی میں دے سکنے سے زیادہ کونسی دلیل قیمتی، وزنی اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہر تاریخی موڑ پر جبکہ قوموں کے ذہن و کردار کے مطابق اُن کا حرام و حلال متعین کر دیا جانا ضروری ہوتا تھا یہی دلیل پیش کی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ آخری پیغمبر کا آفتاب بھی طلوع ہو گیا۔ انسانیت اپنی تاریخ دہرانے لگی۔ خدا نے بھی اپنے اٹل قانون کو دوہرانے کا اعلان کرتے ہوئے صاف کہدیا:

اتی امر اللہ فلا تستعجلوہ سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون۔ ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علیٰ من یشاء من عبادہ ان انذروا انہ لا الٰہ الا انا فاتقون خلق السموات والارض بالحق۔ تعالیٰ عما یشرکون (سورۂ نحل)

خدا نے حکم دیدیا۔ اب تباہی کو جلد لانے کی خواہش نہ کرو۔ خدا ان سے بلند و پاک ہے جنہیں شریک بنایا جا رہا ہے۔ خدا کے حکم کی طاقت لئے ہوئے فرشتے اس بندہ پر اتارے جا رہے ہیں جسے خدا نے منتخب کیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اس چیز سے خوف زدہ کرے کہ ہمارے سوا کوئی قابل پرستش نہیں۔ لہٰذا تم سب کو برائیوں سے دامن بچا لینا چاہیئے۔ جس خدا نے پست و بلند کائنات کو نفع بخشیوں کے آغوش میں پیدا کیا تھا اُسے باطل، منفی اور تخریبی طاقتوں کی شرکت سے کیا واسطہ؟ وہ ایسی کمزوریوں سے بالاتر ہے۔

اور یہی صاف اعلان وہ محورِ فکر ہے جس پر پوری سورت کو آپ گردش کرتا ہوا پائیں گے۔ یعنی جس نظامِ حیات کو پیغمبر اسلام نے پیش کیا تھا اس سے انکار کرنے والوں کی معاشی بساط الٹ کر رہے گی۔ کوئی طاقت خدا کے اٹل قانون اور اس کے آرڈر کو بدل نہیں سکتی۔ اور جو لوگ اس

قانون کے آگے سر تسلیم خم کر دینگے، وہی امن و عیش کی گود میں، انسانی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کی فرصت پا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے آگے جو سلسلۂ کلام چلتا ہے وہ یوں تھا۔

بت پرستانہ ذہن کی خامیوں، کج فہمیوں اور کمزوریوں کو نمایاں کیا گیا۔ پھر ان بت پرستوں سے جو دعوتِ نبوت کو "اساطیر الاولین" (قدامت پسندوں کے افسانے) خیال کرتے تھے تاریخ کے ذریعہ خطرہ کا الارم دیتے ہوئے بتا دیا گیا۔

قد مکر الذین من قبلہم فاتی اللہ بنیانہم من القواعد فخر علیہم السقف من فوقہم واتاھم العذاب من حیث لا یشعرون۔

پچھلی قوموں نے بھی ڈپلومیسی کی تھی۔ نتیجہ میں خدا نے ان کی تعمیرات کو بنیادوں سے گرا دیا۔ عمارات کی چھتیں اوپر سے آن پڑیں اور اس طرح ان پر تباہی آ گئی۔ بالکل بے خبری کے عالم میں۔

تاکہ وہ انسانیت جو ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلنی اور تجربہ ہی سے سبق حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اپنی تاریخ کی روشنی میں اگلا قدم متعین کر سکے۔ اور وعدۂ تباہی کو پرانے افسانے سمجھ کر نظر انداز کر دینے کی حماقت نہ کی جائے۔ خدا کا قانونِ سعادت و شقاوت، آخرت ہی کیلئے نہیں بنایا گیا تھا۔ اگر کوئی قانونِ زندگی کا قانون ہو تو اُسے زندگی کے ہر پہلے، ہر سمت اور ہر کنارے پر بالا دستی طلبی کرنا چاہئے۔ مسلمانوں سے بھی جب کفار نے قرآنی تعلیمات کے بارے میں ان کی تنقیدی رائے دریافت کی تو انھوں نے پہلے وقفہ ہی میں اپنے یقین کا مکمل تصور پیش کر دیا تھا۔

ماذا انزل ربکم، قالوا خیراً للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ ولدار الاخرۃ خیرٌ۔

جو کچھ تمہارے نشو و نما دینے والے نے دستورِ زندگی بھیجا ہے وہ کیا کچھ رکھتا ہے۔ جواب دیا گیا نفع بخشی اور زندگی کے ہر پہلو میں بہتری۔ جن لوگوں نے خدا کے دستور پر حسن کاری سے عمل کیا ہوگا۔ ان کیلئے موجودہ زندگی میں بھی حسین و جمیل اور خوشگوار زندگی ہے اور مستقبل کی زندگی تو ہر طرح بہتر ہی بہتر ہوگی۔

اس مثبت پہلو پر مکمل یقین رکھنے والوں کے خدا نے منفی پہلو کے بارے میں بھی بتا دیا کہ یہ بھی مکمل ہی ہے۔ فرقہ مودودیہ کا عقیدہ کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو۔ خدا کو آج بھی وہی قدرت حاصل ہے جو ظالم و مشرک کو عذاب میں مبتلا کرنے کیلئے بعد از قیامت مل سکتی تھی۔ اگر یقین نہ ہو تو۔

فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین۔

ہفت اقلیم کے تاریخی واقعات و آثار کا مشاہدہ کرو اور گہری نگاہ سے دیکھو کہ جن لوگوں نے ہماری طاقت اور قانون کو جھٹلایا تھا، انھیں کون سے ٹھوس نتیجہ سے گذرنا پڑا۔

قرآن دریافت کرتا ہے کہ آخر یقین نہ آنے کی وجہ کیا ہے؟ تاریخی واقعات کو چھوڑ کر اگر تم خدا کی ان تخلیقی طاقتوں کا اندازہ کرو جو کائنات بہت دُور میں اپنی نمائش کر رہی ہیں، اس کنٹرول کا جائزہ لو جو بلندیوں اور کرۂ ارض میں ہر لمحہ نگرانی کر رہا ہے اور کائناتی زندگی کے ہر اُس فیصلہ کن پہلے کا مطالعہ کرو جو نہ کبھی بدل سکا اور نہ کائناتی شعور اسے متعین کر سکتا تھا تو بغیر تاریخ کے بھی سائنس اور اس کی دریافتوں سے تم خدا کے اٹل قانون کا یقین حاصل کر سکتے ہو۔ اولم یروا الی ما خلق اللہ من شیٔ (خدا نے جو کچھ پیدا کیا تھا کیا تم نے ان کا علمی مطالعہ نہیں کیا) سے لے کر "لہ ما فی السماوات والارض ولہ الدین واصبا" تک یہی بات کہی گئی تھی۔ لیکن چونکہ انسانیت کا عام شعور اور اس کا تاریخی مطالعہ اتنا بلند نہیں ہوتا کہ صرف انہی پہلوؤں سے زندہ یقین کے ہمالیہ پر پرواز کرنے لگے۔ اسلئے انسانی تمدن کے مختلف

گوشوں، روزمرہ کی زندگی میں پیدا ہونے والی سہولتوں، نعمتوں اور خوشگواریوں کو پیش کرکے خدا کی برسرعمل یگانہ طاقتوں کا اندازہ کرنے اور اُس شاہراہ پر لانے کی کوشش سے گریز نہیں کیا گیا۔ جو بت پرستوں کے مفاد پرستانہ معاشی نظام کو چھوڑ دینے پر آمادہ کر سکتا ہو۔ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ (تمہارے پاس جو کچھ بھی تمدنی خوشگواریاں ہیں۔ ان کا سرچشمہ خدا کے سوا کوئی نہیں) سے قرآن نے تمدنی زندگی کے مختلف گوشوں کو پیش کرتے ہوئے آخر میں ان ہی نعمتوں سے متعلق ایک نفسیاتی دلیل کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

اذا مسکم الضر فالیہ تجئرون

جب تمہیں روزمرہ کی زندگی میں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو تمہاری مانگوں کا رُخ خدا کی طرف ہو جاتا ہے اور تم اُسی کو فریاد کرنے لگتے ہو۔

اگر انسانیت کا نفسیاتی رجحان، پیدائشی طور پر غیر محسوس طاقت کی کوئی کشش نہ رکھتا ہوتا تو بیساختہ طور پر اس کا جذباتی رخ ہمیشہ نہ بدلتا رہتا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تم مشکلات کے دور سے گذر جاتے ہو تو تمہاری خدا پرستی کو بھی موت آجاتی ہے۔ مگر کیوں؟ اسلئے نہیں کہ تم نے اپنے نفسیاتی احساس کے جھوٹے ہونے کا اندازہ کر لیا تھا بلکہ صرف اسلئے کہ تمہیں جو سرمایۂ عیش و طرب نصیب ہو گیا تھا۔ اُس سرمایہ داری اس فضل اور اس معاشی طاقت کے تقاضوں کو پورا کرنا نہیں چاہتے۔ جو تقسیم دولت کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اچھا تم کچھ زمانہ تک اس دولت مندی سے فائدہ اٹھالو۔ مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ دولت مندی کے تقاضہ کو پورا نہ کرنے کے وہی تباہ کن نتائج نکلتے ہیں یا نہیں جنھیں پچھلی تاریخ دہراتی رہی۔

ثم اذا کشف الضر عنکم اذا فریق منکم بربھم یشرکون۔ لیکفروا بما اٰتینٰھم فتمتعوا فسوف تعلمون۔

جب نقصانات کا تاریک نقاب اجتماعی زندگی کے چہرہ سے اتر جاتا ہے تو فوراً ہی اس سوسائٹی کا ایک گروہ (سب عوام نہیں) تمدنی نشوونما دینے والے کی طاقتوں میں شریک بنانے لگتے ہیں۔ تاکہ اس پردہ میں جو کچھ ہم نے انھیں دولت و سرمایہ دیا تھا، اس کے تقاضوں کا انکار کر سکیں۔ اچھا کچھ دنوں فائدہ اٹھالو۔ کچھ دنوں ٹھہر کر تمہیں نتائج کا پتہ چل جائے گا۔

تمام معاشی سہولتوں کو تنہا خدا کی طرف منسوب کرنے اور کارسازیوں میں شریک بنانے والوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہوئے قرآن نے شریک بنانیوالوں کی تو ہم پرستانہ حرکات انکی خدا پرستی کا خود پرستی سے بھی کم درجہ ہونا اور اپنی روزی کم ہو جانے کے اندیشہ میں معصوم بچیوں کو قتل کر دینے والا ناپاک کیرکٹر سامنے رکھ کر بتایا کہ یہ سب کچھ برائیاں محض اس بنیاد پر ہیں کہ نئی زندگی اور غیر متوقع انقلاب پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر خدا اور اس کی انقلاب آفرینیوں پر ایمان ہوتا تو ان کی زندگی بلند کیرکٹر کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہوتی۔

للذین لا یؤمنون بالاخرۃ مثل السوء وللہ المثل الاعلیٰ

جو لوگ مستقبل میں نئی زندگی پیدا ہو سکنے کا یقین نہیں رکھتے ان کی کردار کی تمثیل ایک بُری تمثیل ہے اور خدا کا ہر عمل سانچہ بلند و برتر۔

ایسے ذہن اور ایسے بیدردانہ مظالم کے نتیجہ میں اگرچہ ابدی قانون کا فیصلہ، نافرمان قوموں کی مکمل تباہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ اس ابدی قانون ہی نے زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے لئے منازل مقرر کر دیئے تھے۔ اس لئے قوموں کو نتائج تک پہنچانے میں تاخیر سے گذرنا پڑیگا مگر زندگی کی نفی کرنے والا تباہ کن لمحہ آجانے پر کوئی کائناتی طاقت بھی ایک لمحہ کی کمی بیشی نہ کر سکے گی۔

ولکن یؤخرھم الیٰ اجل مسمّیً فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔

لیکن انھیں پیچھے ڈالا جا رہا ہے مقررہ تاریخی منزل تک پہنچنے کیلئے۔ مگر جب ان کا مقررہ وقت آجائیگا تو ایک گھنٹہ کی کمی بیشی بھی نہ کی جا سکیگی۔

مگر کسی آئندہ زمانے میں تباہی کا انتظار کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آج ہی کی زندگی بھی لیکن وہ مشکلات اور تباہی کے تاریک غار کی طرف بڑھتے رہنے سے آزاد ہو سکتی ہے۔ جن خوشگواریوں سے وہ گذر رہے ہیں ان میں تباہی کی طرف کھینچے چلے جانے سے روکنے کی کوئی طاقت نہیں۔

وتصف السنتہم الکذب ان لہم الحسنیٰ، لاجرم ان لہم النار وانہم مفرطون۔

اس گروہ کی زبانیں جھوٹ بول رہی ہیں (دل نہیں) کہ ان کیلئے خوشگواریاں ہی خوشگواریاں ہیں۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ کہ انھیں تباہ ہونا ہے اور وہ اس تباہی کی طرف بڑھائے جا رہے ہیں۔

اگر خوشگوار زندگی، منکروں کے لئے طے ہو جاتی تو خدا اپنا دستور زندگی اُتار کر یقین کرنے والوں کو اندرونی تضاد سے دور کرنے، اور اپنی رہنمائی و نوازشات سے کیا امتیاز سپرد کر سکتا تھا۔ اسی لئے کہدیا گیا کہ

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لہم الذی اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون۔

دستور و آئین اتارنے کی غرض اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ جن معاملاتی پہلوؤں میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ انھیں صاف روشنی میں طے کرا دیا جائے، اختلافات دور کرنے کیلئے جس رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اسے پورا کیا جائے اور ان پر عمل کرنے کیلئے ہر سہولت یقین کرنے والوں کو فراہم کی جائے۔

مگر پھر بھی ایک تشنگی رہ جاتی تھی۔ جو خدا اپنے دستور و آئین کے سہارے قوموں کو تاریخی تعمیر و تخریب سے سہولتیں دینے کا دعویٰ کر رہا ہے کیا اسی خدا کا قانون ربوبیت و پروردگاری، زندگی کے مختلف گوشوں میں تخلیقی انقلابات کے ذریعہ انسانیت کی نفع بخشیوں کیلئے کام کر رہا ہے یا نہیں۔ اگر زندگی کا ہر گوشہ ایک ہی نور سے جگمگا رہا، اور ایک ہی قانونی گرفت میں جکڑا ہوا ہے۔ تو انسانی فکر و شعور کو خدا کی یگانہ طاقت اور یگانہ قانون کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے گا۔ "واللہ انزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا" سے لیکر تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں تک اسی قانون ربوبیت کی گوناگوں کارفرمائیاں دکھائی گئی ہیں۔ اور سب سے آخر میں خود انسان اپنی انفرادی زندگی میں نفی و اثبات کی جن گردشوں سے گذرتا ہے اُسے

واللہ خلقکم ثم یتوفاکم ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکی لا یعلم بعد علم شیئا ان اللہ علیم قدیر۔

خدا ہی نے تمہیں پیدا کیا وہی عمر کا پیمانہ لبریز کرتا ہے اور تمہاری سوسائٹی ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جنھیں انتہائی عمر تک واپس کر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد، کچھ بھی نہ جانے۔ خدا بہت زیادہ علم اور بہت زیادہ قدرت رکھتا ہے۔

کی آیات میں زیر مطالعہ لاتے ہوئے کھلا ہوا اشارہ کیا گیا۔ کہ قانون پروردگاری کی زائیدہ نفی و اثبات، تخریب و تعمیر، تمہاری شخصی زندگی میں بھی طرح طرح سے کام کر رہی ہے۔ ایک شخص کا پیدا ہو جانا اور مر جانا بھی اس قانون کے سچے ہونے کی شہادت دیتا ہے اور جوانی میں سب کچھ معلوم کر لینے کے بعد بڑھاپے میں بھول جانا بھی۔ گویا کہ جسمانی اور ذہنی دونوں پہلوؤں میں نفی و اثبات کا ضابطہ ایک ہی طرح کام کر رہا ہے۔ لہذا تمہیں یقین رکھنا چاہئے کہ جس خدا کا ابدی قانون، تاریخی زندگی، کائناتی زندگی بلکہ شخصی زندگی تک یکسانیت ہی کے ساتھ کام کر رہا ہو۔ اس کے بارے میں یہ دھوکا کھانا کہ کسی دوسری طاقت کے ذریعہ اسے بدلا جا سکے گا۔ کسی طرح بھی انسانی شعور و تجربہ سے ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکتا۔

کسی پر کسی منفی پہلو سے گزرنا اور کسی کا مثبت پہلو سے۔ یہ انفرادی یا اجتماعی طاقتوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے۔ لہذا تمہیں جو کچھ تمدنی عیش اور نعمتیں حاصل ہیں انھیں اپنی کارکردگی سے منسوب نہ کرو بلکہ وہ خداداد ہیں اور خدا ہی کے ضابطۂ حیات کے مطابق دیر تک ان سے فائدہ

اٹھایا جاسکے گا۔ یہیں وہ زیرِ بحث آیت آتی ہے جہاں خدا نے کہا تھا کہ

واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق، فما الذین فضلوا برادی رزقھم علیٰ ما ملکت ایمانھم[1] فھم فیہ سواء۔ افبنعمۃ اللہ یجحدون۔

اور اللہ ہی نے تم میں سے کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں پر اقتصادی برتری دی تھی مگر جن لوگوں کو اقتصادی برتری دی گئی وہ واپس کرنیوالے نہیں اپنی دولت کو اپنے زیرِ دستوں پر تاکہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں۔ کیا وہ خدا کی نعمت کے منکر ہیں۔

جس طرح تم زندگی کے مختلف گوشوں میں دیکھتے چلے آرہے ہو کہ "وما بکم من نعمۃ فمن اللہ (تمہارے پاس کوئی ایسی تمدنی سہولت نہیں جو خدا نے نہ دی ہو) کا دعویٰ ٹھوس واقعات پر مبنی تھا۔ ایسے ہی مال و دولت میں کچھ لوگوں کا کم اور کچھ لوگوں کا زیادہ ہونا بھی خدا ہی کی نعمت ہے، تمہاری انفرادی صلاحیت سے نہیں پیدا ہوا۔ لہٰذا تمہیں حقوقِ ملکیت کے نام پر شکرِ نعمت کے ان تقاضوں کو نہیں ٹھکرانا چاہئے جو محنت سے پیدا کرنے والوں کی طرف، سرمایہ کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور صرف اسلئے کہ خدا کی جن نعمتوں سے تم آرام اٹھا رہے ہو ان سے خدا کی وہ مخلوق بھی فائدہ اٹھا سکے جسے قوانینِ پروردگاری نے معاشی ارتقا کیلئے مختلف پوزیشن سپرد کر دی تھی۔ اپنی ملکیت، اپنا حق اور اپنی چیز سمجھتے ہوئے اپنی مرضی پر چلنا صرف یہی معنی رکھتا ہے کہ تم اس دولت کے خداداد ہونے سے انکار کرتے ہو۔ اقرار کی صرف ایک صورت ہے کہ جمعِ زر کی بجائے، تقسیمِ دولت سے کام لیا جائے۔ وہ اقرار نہیں جو حالات بدل جانے کے ساتھ ہی بدل جاتا ہو جیسا کہ پہلے بھی تاریخ میں ہو چکا۔

ومنہم من عاھد اللہ لئن اتانا من فضلہ لنصدقن ولنکونن من الصالحین، فلما اتاھم من فضلہ بخلوا بہ وتولوا وھم معرضون۔

اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے عہد و پیمان کیا تھا کہ اگر خدا ہمیں بہت سی دولت دیدے تو ہم اُسے ضرور تنگدستوں پر تقسیم کرینگے اور ہو جائیں گے صالح بندوں میں سے۔ مگر جب ہم نے انھیں بہت سی دولت دیدی تو اُسے تقسیم کرنے میں بخل سے کام لینے لگے، وعدہ سے پھر گئے اور منہ موڑ لیا۔

خدا کا صالح بندہ بن سکنے کیلئے اسلامی جماعت کا ممبر ہونے کی بجائے تقسیمِ دولت کا ذوق پیدا کرنا پڑتا ہے انسانیت بھی اپنی جگہ محسوس کرتی ہے کہ یہی راستہ خدا کی خوشنودی کا راستہ ہے۔ اسی لئے عہد و پیمان کئے جاتے ہیں مگر وقت پر غریبوں کو یاد نہیں رکھا جاتا۔ یہی وہ نکتہ تھا جسے خدا نے مذکورہ آیت میں یاد دلایا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اسلامی جماعت کا سیاسی ذوق کسی ایسے تصور کو برداشت ہی نہیں کر سکتا جو دولت مندوں کو معاشی بحرانوں، سرمایہ و طاقت کی تباہی اور "النار الذی تطلع علی الافئدہ" (وہ آگ جو انسانی قلوب میں بھڑک رہی ہے) کے نتائجِ بد سے ڈرا کر فنکاروں کو ہر ممکن سہولت فراہم کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔ اسلامی جماعت کے نزدیک سرمایہ دار، جی چاہے کچھ دے، جی چاہے نہ دے۔ دنیا میں اسے چھیڑنا خدا کو ناراض کرنا ہے۔ ہاں آخرت میں طاقتور خدا کے عذاب سے ڈرانے کی اجازت دینے میں کچھ حرج نہیں۔ حالانکہ خدا تقسیمِ دولت ہی کو ان نشانیوں میں سے بتاتا ہے جس سے اطاعت گزار بندے پہچانے جا سکتے تھے۔

---

[1] حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بھی اپنی تصنیف اسلامی معاشیات میں اس فقرہ سے یہی مطلب نکالتے ہیں کہ سرمایہ دار کو ایسا حقِ ملکیت نہیں دیا گیا کہ وہ واپس کرنے سے انکار کر سکے۔ مگر نعیم صاحب تجوری میں بند رکھ سکنے کا حق دینے ہی کیلئے اس آیت کو استعمال کر رہے ہیں۔ نہ معلوم گیلانی صاحب نے بھی با ترجمہ قرآن پڑھا تھا یا یوں ہی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ ہو گئے۔ (ابو النظر رضوی)

کلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً واشکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔

خدا نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں جائز و خوشگوار چیزیں کھاؤ (استعمال کرو) اور خدا کی نعمتوں کے تقاضہ کو پورا کرو، اگر تم صرف خدا ہی کی اطاعت کر رہے ہو۔

کیونکہ شکرِ نعمت بجا نہ لانے میں شرک کا پہلو پایا جاتا تھا۔

ان ابراھیم کان امۃ قانتاً للہ حنیفاً ولم یک من المشرکین، شاکراً لانعمہ

ابراہیمؑ راہ ڈالنے اور خدا کی طرف یکسو ہو کر فرمانبرداری کرنے والا تھا شرک کرنے والوں میں سے نہیں۔ اپنی تمدنی سہولتوں کا حق ادا کرنے والا بھی۔

انسانیت خدا کی نعمتوں کا انکار، جن و رثار کی خاطر کرتی رہتی ہے۔ خدا نے انھیں بھی اپنی نعمت قرار دے کر مطالبہ کیا کہ خدا کی نعمت کو خدا کی نعمت کا تقاضا پورا کرنے میں رکاوٹ نہ بنا دینا چاہئے۔

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجاً وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ ورزقکم من الطیبات افبالباطل یومنون وبنعمت اللہ ھم یکفرون۔

خدا ہی نے تمہاری بیویوں کو تمہاری جنس سے بنایا اور بیویوں سے لڑکے اور پوتے پیدا کئے۔ اور تمہیں خوشگوار چیزیں روزی کیں۔ کیا (بیرونی اور اندرونی نعمتوں سے سرفراز ہو کر بھی) باطل پر یقین کرو گے۔ اور خدا کی نعمتوں کا انکار۔

آپ نے غور فرمایا، خدا کے نزدیک کفرانِ نعمت کی بنیاد باطل پر ایمان اور خدائے یگانہ سے بے یقینی پر قائم ہوتی ہے۔ حالانکہ زندہ خدا کا قانون بھی زندہ ہے اور وہ کفرانِ نعمت کرنے والوں کی باطل پرستی سے اثر پذیر ہوتے ہوئے انھیں تباہ کن نتائج پر پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایسی صاف و صریح پوزیشن کو تاریکیوں میں گم کر دینے کے لئے مولائے محترم نے جو جو داؤ پیچ کھیلے ہیں اور صرف اس ڈر میں کہ کہیں حقوقِ ملکیت کی پاکیزگی پر حرف نہ آجائے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ حالانکہ اس آیت سے انفرادی ملکیت پر کوئی زد ہی نہ پڑتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سرمایہ داروں کو انفرادی ملکیت کے نام پر یہ حق نہیں پہنچ سکتا تھا کہ وہ مزدوروں اور کاشتکاروں کو اپنا جیا تمدنی معیار سپرد کرنے کے لئے تقسیم دولت سے انکار کر دیں۔ اگر انکار کیا جائیگا تو اس کا مطلب، کافرانہ نظامِ زندگی کی طرف جھکنے اور تباہی سے قریب ہوتے جانے کے سوا کچھ نہیں لیا جا سکتا۔ ایسے ذہن و کردار کو بہرحال تباہ ہونا ہے خواہ قدرت اپنی چکی میں پیس کر سرمہ کر دے یا کوئی انسانی جد و جہد سرمایہ داروں پر آنے والی تباہی سے عوام کو بچانے کیلئے کوئی ایسا آئینی سانچہ بنانے جو منڈلاتے ہوئے عذاب کی آندھی کو چھانٹ دے سکتا ہو۔

انفرادی ملکیت کو دینِ مکمل کا جزء قرار دینا ہمالیہ سے بڑی غلطی ہوگی۔ ملکیت کے سانچوں کے بدل دینے سے اگر انسانیت کا بوجھ ہلکا ہوتا ہو، انھیں سہولتیں نصیب ہو جاتی ہوں۔ خدا کے بندے، بندوں کی گرفت سے نکل سکتے ہوں اور اخلاقی کردار پر عمل کرنے کے لئے انھیں زیادہ سے زیادہ آزادی مل جانے کے امکانات ہوں۔ غرضکہ خدا انسانیت کو امن و عیش کی جس راہ اور انسانی صلاحیتوں کو مکمل ترین نشوونما کی جس منزل تک لے جانا چاہتا ہے۔ اگر وہ کسی بھی نئے پیداواری ڈھانچہ سے قریب تر ہو سکتی ہو، تو اُسے بے دینی اور ایمان فروشی کہنا، حق پرستانہ ذہن کی توہین ہوگی۔ خاندانی دور سے لیکر آج کے مشینی دور تک اجتماعی زندگی کے نقشہ میں جو کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ان کا لحاظ کرنے سے خدا نہیں روکتا اسے اپنا نصب العین عزیز ہے نئے اور پرانے سانچے نہیں۔ جمع زر کیلئے آپ ذرائع پیداوار بدل سکتے ہیں لیکن انسانیت کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے کیلئے تقسیم زر سے انکار نہیں کر سکتے۔ ذالک الدین القیم۔ (یہی ہے زندگی سنوار دینے والا فیصلہ)

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہزاروں برس سے انفرادی ملکیت کے تصور نے ایک وراثتی تصور کی شکل اختیار کر لی ہے، اسے بالکل مٹا دینے کی کوشش کے بجائے اگر توازن بروئے کار لا دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس حد تک خود اشتراکیت کو بھی انکار نہیں۔ ہاں وہ اسے گوارہ نہیں کر سکتا کہ "بے حد و بے نہایت ملکیت کا حق" دیا جائے۔ جسے علامہ مودودی "خدائے اسلام کا قانون" کہتے ہیں۔ آپ کو خیال ہوگا کہ اگر مودودی صاحب کے نزدیک بے حد و بے نہایت ملکیت کا حق دینا ضروری ہے تو نعیم صاحب صدیقی کے نزدیک بھی ضروری ہوگا۔ اسلام کے ابدی قانون کو کم از کم کسی ایک جماعت کے "دو تو ام لیڈروں" کے حد تک تو نہیں بدل جانا چاہئے۔ لیکن "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" کا کیا علاج؟ نعیم صاحب زورِ قلم میں یہ بھی فرما گئے کہ

> روکا جس چیز کو گیا وہ یہ تھی کہ تفاوتِ رزق کو غیر فطری (منکر) ذرائع فطری معیار سے زائد حد تک مصنوعی طریق سے بڑھایا نہ جائے۔ چنانچہ املاک پر اسلام کے اخلاقی حدود جاری رہے اور تفاوتِ رزق اپنی حد اعتدال پر قائم رہا۔ بعد میں دور ملوکی نے اسے فطری سطح سے ہٹا کر غیر فطری حدود تک وسیع کر دیا۔

مولانائے موصوف کی نگاہ اس نقطہ تک تو پہنچ گئی کہ "تفاوتِ رزق کے لئے بھی حد اعتدال ہونا چاہئے۔ اسلام کے اخلاقی حدود نے انھیں اعتدال سے آگے بڑھنے بھی نہیں دیا اور یہی وہ نقطۂ بحث ہے جس کے گرد آج کا سائنٹفک ذہن گردش کر رہا ہے۔ انفرادی ملکیت سوویٹ روس میں بھی ہے اور امریکن بلاک کے تمام مغربی ممالک میں بھی۔ مگر ایک بلاک اسے حد اعتدال پر قائم رکھنا چاہتا ہے اور ایک کوئی حد و نہایت نہیں مقرر کرنا چاہتا۔ اگر اسلام کے اخلاقی حدود ملکیت کو حد اعتدال پر قائم رکھنے کیلئے کام کرتے رہے ہیں تو جس تاریخی دور میں اخلاقی رجحان بڑی حد تک مردہ ہو گیا ہو، وہاں ملکیت کو حد اعتدال میں رکھنے کی کیا صورت پیدا کی جائیگی؟ قرآن و حدیث ایسی سوسائٹی کو متوازن بنانے کیلئے کیا مشورہ دے رہے ہیں؟ وعظ گوئی کا یا آئینی گرفت کا۔ پھر معتدل اور غیر معتدل ہونے کی کسوٹی کیا ہوگی؟ جس پر پرکھ کر ہر شخص اپنے دل کو مطمئن کر سکے۔

ان پہلوؤں کو صاف کرنے کی جگہ مولانا "فطری اور غیر فطری ذرائع" طے کرنے کی الجھن میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ سچائیوں پر پردہ ڈالا جا سکے۔ چوری، جوئے بازی اور جعل سازی سے رقم جمع کرنے والے ساری انسانی تاریخ میں بھی کسی ملک کا اقتصادی توازن شکست نہ کر سکے۔ تفاوتِ رزق کو حد اعتدال سے ہمیشہ انہی لوگوں نے آگے بڑھایا تھا اور بڑھا رہے ہیں جنھیں قانون سازیوں نے سہارا دیا تھا، برلا، ڈالمیا اور یورپ کی حکومتوں پر چھا جانے والے کروڑ پتی بقول نعیم صاحب کے "محنت و سرمایہ کی باہمی مفاہمت" کے ہاتھوں پیدا ہوئے تھے۔ آج انسانیت جن سرمایہ داروں سے بے زار ہو چکی ہے وہ سلطانہ ڈاکو کی نسل سے نہیں شرفاء کی اولاد ہیں اور ملکی قانون کے پابند۔ اگر اسلامی جماعت کو اقتدار نصیب ہو جائے تو وہاں بھی بالکل وہی قوانین تیار کئے جائیں گے جنھوں نے یورپ کے کارخانہ دار کو پیدا کیا۔ آخر نظامِ کارخانہ داری میں اسلامی جماعت کو نسا بنیادی انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ جس کے پیش نظر امریکن اور سوویٹ نظام کو اسلام کی طرف سے چیلنج دیا جا سکے۔

ان مغالطہ آفرینیوں سے الگ ہو کر اسلامی جماعت کو سوچنا چاہئے کہ اخلاقی رجحانات کمزور پڑ جانے پر ملکیت کا کونسا سانچہ، ملکیت کو حد اعتدال میں رکھنے کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ انجمنہائے امداد باہمی کو کامل انفرادیت اور کامل اجتماعیت کے درمیان، حد اعتدال قائم کرنے والا خیال کرنا بھی وہی آواز بازگشت ہے۔ جو تمام مغربی ممالک میں گونجنے کے بعد، مولانا نعیم صاحب کے گوش حق نیوش تک پہنچی ہے۔ اگر یوں حد اعتدال قائم ہو سکتی تو کسی کو بھی یورپ کے سرمایہ داروں سے اختلاف نہ رہتا۔ یہ سبق تو اپین میں بنی امیہ بھی دہرا چکے ہیں۔ مگر اسلامی جماعت والے پھر بھی اُن کے اقتصادی نظام کو معتدل اور اسلامی نظام تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔

کیا اتنا کچھ عرض کرنے کے بعد میں مولانائے محترم سے درخواست کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے "چراغِ راہ" سے روشنی و رہنمائی دینے کی کوشش فرمائیں گے۔ مگر اس "چراغ" سے نہیں جس کے بارے میں کسی نے کہا تھا — "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"۔ مگر اس کا خیال رہے کہ آپ کو رہنمائی دیتے ہوئے اس رہنمائی کو بھول جانے کا حق نہ ہوگا جو مولانا مودودی صاحب دارالسلام قائم کرتے وقت دے چکے ہیں:۔

> مدینۂ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اسوقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دیندار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں، ان کے نزدیک سلف صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ — تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر (Foscilised) صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم چلتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے۔ جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے، ہم کو "خیر امۃ" جو بنایا گیا ہے تو یہ اسلئے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر (Roarguard) کی حیثیت میں لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور ہمارے "خیر امۃ" ہونے کا راز "اخرجت للناس" ہی میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اصلی اسوہ، جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہئے، یہ ہے کہ انھوں نے قوانینِ طبیعی کو قوانینِ شرعی کے تحت کر کے، زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا، ان کے عہد میں جو تمدن تھا، انھوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی — پس نبیؐ و اصحابِ نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقاء اور قوانینِ طبیعی کے انکشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اول میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔ (نشانِ راہ ص۵۵)

آج سے سالہا سال پہلے دارالسلام کا پروپیگنڈا کرنے کیلئے مذکورہ بالا عبارت میں جو کچھ کہا گیا تھا۔ اگر وہ ایک نہ مٹ سکنے والی سچائی تھی۔ تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ پرویز آج جو طرزِ فکر پیش کر رہے ہیں اس میں کیا غلطی تھی؟ وہ بھی عہدِ نبوت کے ظاہری اشکال میں مماثلت ضروری قرار نہیں دیتے اور مودودی صاحب بھی، وہ بھی عربی تمدن کو متحجر صورت میں قبول کرنے کو دین نہیں خیال کرتے اور یہ بھی۔ وہ بھی آثارِ قدیمہ بن کر قدیم تمدن کا تاریخی ڈرامہ کھیلنا پسند نہیں کرتے آپ بھی۔ وہ بھی تغیر و ارتقاء کو صحیح راستوں پر ڈالنا چاہتے ہیں اور مولانا بھی۔ وہ بھی اسوۂ رسولؐ اور

اسوۂ صحابہ کا صحیح تصور قوانین طبیعی کو دین و آئینِ الٰہی کے تحت کرنا سمجھتے ہیں اور علامۂ محترم بھی، وہ بھی نئے نئے وسائل میں گندگی محسوس نہیں کرتے اور اسلامی جماعت کے "امیر الصالحین" بھی۔ اگر دونوں کے تمام بنیادی تصورات یکساں ہیں تو "فتنۂ پرویز" سے خوف زدہ کرنے کی کیا مصلحت تھی؟ ہاں ایک بات ہو سکتی ہے کہ پہلی آواز پروپیگنڈے کے طور پر فاران کی چوٹیوں سے بلند کی گئی ہو اور دوسری آواز بلند کرنے پر سیاسی اور مذہبی اقتدار نے مجبور کیا ہو۔

بہرحال اگر ہمارے نعیم صاحب کے گوش حق نیوش میں وہ "نغمۂ الست" گونج رہا ہو جو کبھی "نشانِ راہ" بنا ہوا تھا تو زندگی کے تمام گوشوں پر اسی منارہ سے روشنی ڈالئے اور اسی کے اشاروں پر رہنمائی دینا چاہئے۔ یہ طریقہ یقیناً غلط ہوگا کہ قدیم تمدن کو چمٹ کر ظاہری اشکال کو ابدی یقین کرکے اور روحِ اسلام کی بجائے، عہدِ نبوی کے قالب کو حرف آخر سمجھ کر بھی آپ علامۂ مودودی کو بغیر "توبہ نامہ" شائع کرلئے، امیر جماعت مانتے رہیں۔ لیکن اگر اس بنیادی اعلان کے سایہ میں آپ کا وہ پیداواری نظام بھی ابدی قانون بنایا جاسکتا ہو، جس کا مطالبہ تمدنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ قومی ملکیت کی طرف بڑھتے جانے سے بالکل روک دیتا ہے تو ایسے ادبی شاہکار کو ضرور پیش کیجئے۔ خدا کی منصوبہ بندی، ربوبیت و پروردگاری کی بنیادوں پر ہوتی رہی تھی، لیکن اگر اس کا خلیفہ، جسے آج "امیر جماعت" کا نام دیدیا گیا ہے تمدنی نشوونما کے ہر سانچے کو توڑ دینا چاہتا ہو تو یہ بھی حسرت نکال لینا چاہئے۔ زندہ خدا، قوموں کی نشوونما کا راستہ بند کرنے والوں کو ہمیشہ جھاگوں کی طرح مٹاتا رہا۔ ذالک سنۃ اللہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ (یہ خدا کا طرزِ عمل ہے اور اس عملی قانون میں کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے۔)

سلسلۂ گفتگو بند کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ مولانائے محترم نعیم صاحب صدیقی سے ایک درخواست کی جائے۔ ہماری خوش قسمتی سے مولانا محترم کی "سات پشتوں میں ہمیشہ قرآن فہمی کا شاہکار پیش کرنے والے مشاہیر علماء، مفسرین اور مفکرین اسلام پیدا ہوتے رہے ہیں۔"

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ او

اور پھر اتفاق دیکھئے کہ خود مولانا بھی اسلام کے مزاج شناس اور امت مرحومہ کے نبض شناس واقع ہوئے ہیں۔ قرآن کی ہر آیت کا اگلا، پچھلا حصہ بھی مولانا کو خوب اچھی طرح حفظ ہے جس کی وجہ سے انھیں دیگر کسی مومنین کی طرح اعضا کی قطع و برید نہیں کرنا پڑتی۔ احادیث پیغمبر پر تو مولانائے محترم کی جماعتی تحقیقات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی حدیث فہمی کو بھی چیلنج دیدیا گیا۔ ایسے زریں موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا، صدیوں تک انسانی شعور و تجربہ کو رہنمائی سے محروم کر دینا ہوگا۔ اسلئے بصد ادب گذارش ہے کہ جب بات قرآن اور اس کے اقتصادی نظام تک پہنچ گئی ہے تو آپ کو ایک قدم بڑھا کر قرآن کا اقتصادی نظریہ قرآن ہی کی آیات سے پیش کر دینا چاہئے تاکہ یہ روز روز کا قصہ ہی ختم ہو۔ اور پھر وہی مبارک ساعت واپس آجائے جو قد تبین الرشد من الغی دکھلا کر سامنے آگیا ٹھیک راستہ اور منزل تک پہنچانے والا، کے وقت آج سے صدیوں پہلے سامنے آئی تھی۔ اس وقت ٹھوس واقعات نے تاریخی موڑ بنایا تھا۔ آپ اپنی فکر و نگاہ سے طے فرما دیجئے۔ آج تک جو کچھ آپ کی جماعت کی طرف سے پیش کیا جاچکا ہے۔ وہ نوجوانوں کو کچھ دیر تک امنڈتے ہوئے سیاہ بادل سے توقعات قائم رکھنے پر تو ضرور آمادہ کر سکے گا، لیکن بالاتر شعور و تجربہ والے خدا کا مکمل اقتصادی نظریہ پیش نہیں کر سکتا۔ حیرت ہے کہ قرآن فہمی کی اتنی زبردست صلاحیت کے باوجود آپ کی جماعت متعارض احادیث میں الجھ کر رہ گئی اور وہ بھی مسئلہ مزارعت (بٹائی) جیسے معمولی مسئلہ میں۔ اگر یہی شب و روز رہے تو پھر اسلام کے اقتصادی نظریہ پر جو مصائب گذرینگی اس کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال اگر آپ پرجوش مذہبی جذبہ کو سب و شتم کی بجائے کسی بلند مقصد کیلئے استعمال کرنا پسند کر سکتے ہوں تو ہم جیسے نادانوں کو دھمکانے، برا بھلا کہنے اور کوچہ و بازار میں رسوا کرنے کی بجائے حسب ذیل سوالات کا قرآن کی روشنی میں

جواب دیجئے۔ قرآن سے جواب مانگنے کا مطلب، احادیثِ پیغمبر سے انکار نہیں بلکہ سب سے پہلے یہ طے کرلینا ہے کہ جس وحی کو محفوظ کر دیا گیا تھا وہ اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ کیا حسن و جمال رکھتی ہے اور براہِ راست قرآن کو انسانی شعور و تجربہ کی رہنمائی کا کہاں تک حق دیا جا سکتا ہے پیغمبر اسلام سب کچھ جانتے ہوں گے لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کا خدا کیا جانتا ہے؟ یا بالفاظِ دیگر وہ اپنے کونسے علم و دانش کو بالکل محفوظ حالت میں ہم تک پہنچانا چاہتا تھا اور کونسی معلومات کیلئے اسے اہتمامِ حفاظت منظور نہ تھا۔

آپ جانتے ہوں گے کہ اقتصادی یا سیاسی نقشہ بنا دینا کوئی کمال نہیں ہے۔ نہ ہر نقشہ ہماری انسانی توجہات کا مرکز بن سکتا ہے۔ اسی لئے آج دنیا ہم سے صرف یہ دریافت نہیں کر رہی کہ تمہارا اقتصادی نظریہ کیا ہے؟ بلکہ وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ جس خدا نے آپ کا اقتصادی نظام بنایا تھا۔ وہ کائناتی قوانین، تاریخی سانچوں، پروردگاری کے سائنٹفک ضابطوں، سرمایہ داری کی تاریخی منازل، انقلابات کے تقاضوں، مختلف پارٹیوں کے تخلیقی رجحانات، افادیت پسندانہ نفسیات کے پہلو، اور باطل طاقتوں میں آمیزشِ حق کا اندازہ کر کے کسی سے ٹکرانے اور کسی سے نہ ٹکرانے کا فیصلہ کر سکنے والا معیار بھی جانتا ہے یا نہیں۔ اگر قرآن کا خدا ان باتوں کو جانتا ہے تو اپنی رہنمائی سے مطمئن کرنے کے لئے اس نے ضرور قرآن میں تذکرہ کیا ہوگا؟ اور اگر تذکرہ نہیں کیا تو کیا صرف "خدا کو سب کچھ جاننا چاہئے" کے گمان پر یقین لانے کی دعوت دی گئی تھی؟

بہرحال ان گوشوں پر روشنی ڈالنا چونکہ پاکستانی نوجوانوں کے یقین کو محکم تر کرنے میں کام آسکتا ہے۔ اس لئے ہم کیوں نہ امید رکھیں کہ آپ ہمیں اپنے "نسلی علم" سے استفادہ کا موقعہ دیتے ہوئے خدا کے علم کی پہنائیوں اور معاشی انقلابات کو ہر تاریخی موڑ پر رہنمائی دے سکنے کی صلاحیتوں سے آشنا کریں گے۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو چند سوالات پیش کرنے کی بھی اجازت دیجئے تاکہ اقتصادی نظام کے کچھ نقشوں میں تو رنگ بھرا جا سکے۔ امید ہے کہ آپ ہر سوال کا جواب قرآنی آیات سے دیں گے۔

(۱) سرمایہ داری کا نشوونما کون سے قانونِ زندگی سے ہوتا ہے اور کیا اس کے تاریخی پلٹے کے لئے کوئی منزل طے شدہ ہے اور یہ کہ کیا سرمایہ داری کا نشوونما، خدا کے قانونِ سعادت کو شکست کرنے کا باعث تو نہیں ہوتا۔

(۲) وسائلِ دولت اور صرفِ دولت کے دونوں پہلوؤں سے خدا کو دلچسپی ہے یا کسی ایک سے اور کیا انسانی نفع بخشی، عمرانی ارتقا اور اخلاقی ضمیر کے مطالبات کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بھی وسائلِ دولت اور ذرائع پیداوار متعین کرنے میں دخل ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو مظالم کو مٹانے اور انسانی صلاحیتوں کو ابھار سکنے کے لئے نئے سے نئے معاشی نقشے بنائے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ جواب قرآن کی آیات سے دینا چاہئے۔ چاہے بعد کو احادیث سے بھی رنگ و بو میں اضافہ کیا جا سکے۔

(۳) صرفِ دولت کا مکمل تصور، جس میں تمام خدوخال نمایاں ہو گئے ہوں، کیا ہے؟ اور کیا اس تصور کو ٹھوس واقعہ میں تبدیل کرنے کیلئے آئین سازیوں سے قرآن نے روک دیا ہے۔ اگر برائیوں سے روک دینے کیلئے آئینی گرفت خدا کو پسند نہیں تو اقتصادی اور اخلاقی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے چور اور زانی کو سزائیں دی جاتی ہے۔ کیا ایسے ہی اغراض کیلئے کوئی نظامِ مملکت مناسب تعزیرات طے کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اگر جواب نفی میں ہو تو پہلے آیات پھر احادیث پیش فرمائیے۔

(۴) تقسیمِ زر نہ کرنے کے جن نتائج پر قرآن روشنی ڈالتا ہے کیا خدا کے نزدیک اس کا ہماری موجودہ زندگی سے بھی تعلق ہے۔ اگر ہے تو انسانیت کی تمام پچھلی تاریخ میں ..... وہ نتائج کونسی ساختوں میں نمایاں ہوتے رہے اور کس حد تک نمایاں ہو سکے اور اگر بعد از مرگ سے ہی متعلق ہوں تو صاف کہئے اور قرآن کی آیات سے تائید حاصل کرتے ہوئے۔

(۵) قرآن کے نزدیک کیا مشرکانہ ذہن و کردار ایک تباہ کن معاشی نظام تھا، یا دماغی مالیخولیا۔ اور کیا قرآن نے اپنے دعوے کو خواہ وہ کچھ بھی ہو علمی، تاریخی اور نفسیاتی دلائل سے ثابت کیا ہے یا فقط ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔

(۶) کیا قرآن کا اپنے حکومتی نظام کو تقسیمِ فے کی ہدایت کرتے ہوئے "کے لا یکون دولۃً بین الاغنیاء" کے تصور کو پیش کرنا نہیں بتا رہا کہ اگر سرمایہ دارانہ ذہن گردشِ دولت کے راستے بند کرنے لگے تو اس کی گردش کو زندہ رکھنے کیلئے ہم ہر وہ معاشی نظام بنا سکتے ہیں جو منزل تک پہنچا سکتا ہو۔

(۷) کیا اسلام کا اقتصادی نظام قرآنی حدود میں ڈھائی فی صدی زکوٰۃ، خود اختیاری خیرات و صدقہ حرمتِ سود اور تقسیم ورثہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ہے تو قرآنی آیات سے انھیں متعین کرکے دنیا کو اپنے "دینِ کمل" کی طرف سے چیلنج دیجئے تاکہ اس زہر آلود طعنہ کا جواب دیا جاسکے کہ تقسیمِ زر کے چند سادہ اور مشہور ضابطوں کا نام اسلام کا اقتصادی نظام رکھدیا گیا تھا، ورنہ وہاں تو کچھ بھی نہیں۔

(۸) جمعِ زر کا وہ کونسا پہلو ہے جسے پسند کیا گیا اور کونسا ہے جسے ناپسند کیا گیا۔ پسند و ناپسند کا معیار کیا ہے؟ نفسیاتی اور خارجی معیار۔ تاکہ گمراہوں کا تعین کرکے گرفت میں لایا جاسکے۔

(۹) قرآن کے زاویۂ نگاہ سے اقتصادی مظالم کون سے کہلائے جا سکتے ہیں۔ اقتصادی عدل کا معیار اس کے پاس کیا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے[لہ] اقتصادی عدل کا کیا نظام بنایا تھا؟ کیا نظامِ ملکیت، ذرائع پیداوار اور پیداواری طریقوں کے تغیرات جبکہ ان سے ضرورتمند انسانوں کی نفع بخشیاں وابستہ ہوگئی ہوں، قرآن کا اقتصادی نظام گوارا نہیں کرتا۔ آیاتِ قرآنی سے شہادت پیش کرنا چاہیے۔

(۱۰) قانونِ وراثت بنانے کے ساتھ ہی قرآن کا بار بار "نحن الوارثون" (ہم ہی وارث ہیں) کہنا یہ نہیں بتاتا کہ وراثتی اغراض کیلئے سرمایہ چھوڑ کر مر جانا خدا کو پسند نہیں اور نہ تاریخی انقلابات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یقینی طور پر نتیجہ خیز۔ لیکن اتفاقات اور انسانی کمزوریوں کو سنبھالنے کیلئے وراثتی قانون بھی بنانا مناسب خیال کیا گیا۔ ایسی حالت میں خود حقِ ملکیت پر جم کر بیٹھ جانا، جس کا فائدہ "من مانی" کر سکنے اور اولادی کیلئے سرمایہ کو محفوظ کر دینے کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے کہاں تک خوشگوار اور پسندیدہ ہو سکتا ہے۔ بینوا و توجروا ——— تلک عشرۃ کاملۃ۔

لیکن اگر خدانخواستہ آپ ان سوالات کا جواب دینے سے گریز کرینگے تو پھر آپ کو اس تختِ اقتدار سے اترنا پڑے گا جس پر آپ لیاقت علی خانصاحب کو نہیں دیکھنا چاہتے۔ کیونکہ اگر دونوں معاشی مسائل کو اسلام کے ذریعہ حل نہیں کر سکتے تو پھر دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اسلامی زاویۂ نگاہ سے اقتدار پر رہنے یا اقتدار چھین لینے کا حق نہ رہے گا۔

لہ اگر جواب دیتے ہوئے مولانا نعیم صدیقی صاحب یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ وہ آج سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ:-

اسلامی حکومت میں انفرادیت اور اجتماعیت کو الگ الگ دائروں کی صورت نہیں دی جاتی کہ فرد اجتماعیت کے دائرے میں جن حدود کا پابند تھا وہ حدود انفرادیت کے دائرے میں اس سے ساقط ہو جائیں اور نجی، کاروباری، مذہبی اور اخلاقی سرگرمیوں میں اسے خود مختار قرار دیا جائے کہ وہ جس کیش اور مسلک کو چاہے اختیار کرلے۔ فرد کی زندگی میں اگر اسلام ہر پہلو سے مداخلت کرتا ہے تو ان تمام پہلوؤں میں اسلامی حکومت بھی مداخلت کرنے کی حقدار ہے کیونکہ اس کا مقصدِ وجود اسلام کو نافذ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

(اسلامی حکومت کی ماہیت۔ چراغ راہ۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

جس کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں کہ اگر اجتماعیت کے دائرے میں معاشی ضروریات کی یکسانی کے پیشِ نظر "تفاوتِ رزق" کو حضرت ابوبکرؓ نے گوارہ نہ فرمایا تھا۔ اسلام کے مزاج شناس ہونے کی بنا پر تو پرائیویٹ زندگی میں بھی انھیں اور صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کو تفاوتِ رزق کا معاشی نظام بنانے پر زور دینے کا حق نہیں۔ ورنہ بقول نعیم صاحب صدیقی کے شرک لازم آجائے گا اور تقسیمِ حیات۔ (ابو النظر رضوی)

مسلمان کا نصب العین

(سید محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی)

طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۵۱ء میں سید محمد جعفر شاہ صاحب کا ایک مکتوب گرامی شائع ہو چکا ہے جس میں طلوع اسلام کی پیش کردہ قرار داد مقاصد کے بعض نکات کی وضاحت چاہی گئی تھی۔ اس خط میں سب سے پہلا نکتہ مسلمانوں کے نصب العین کا تعین تھا۔ چونکہ یہ موضوع بڑا اہم ہے اور اس پر ضمنی طور پر سیر حاصل بحث نہیں کی جا سکتی تھی اسلئے ہم نے اسے خط سے حذف کر دیا اور محترم سید صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس موضوع پر کچھ تفصیل سے تحریر فرمائیں۔ پیش نظر مقالہ ہماری اسی درخواست کے جواب میں ہے۔ قائمین طلوع اسلام میں سے جو حضرات اس بحث سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ہمیں اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیں۔ یہ خود محترم سید صاحب کی بھی خواہش ہے۔ (طلوع اسلام)

نصب العین سے کیا مراد ہے؟ دنیا کا کوئی شخص کوئی کام بغیر کسی مقصد کے نہیں کرتا۔ ایک بچہ بھی جب کھلونوں سے کھیلتا ہے یا بے ترتیب چیزوں کو اِدھر سے اُدھر کرتا اور توڑتا پھوڑتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ وہ لفظ مقصد سے نا آشنا اور اس کے معنی سے بے خبر ہوتا ہے، وہ اس کے تلفظ پر قدرت نہیں رکھتا لیکن تحت الشعور ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور وہی جذبہ اس کی نہ سمجھ میں آنیوالی زبان میں اس کے مقصد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اسے آپ وقت گزاری کہہ لیجئے، تکمیل خواہش سے تعبیر کر لیجئے یا اپنی خوشی پوری کر لینا قرار دے لیجئے، بہر کیف ایک مقصد ضرور اس کے نہاں خانۂ دل میں پنہاں ہوتا ہے خواہ وہ اس کا اظہار کر سکے یا نہ کر سکے ــــ اب اپنے آپ کو دیکھئے۔ آپ بھی جتنے کام کرتے ہیں، خواہ وہ حرکت ہو یا سکون، سب کا ایک مقصد ہوتا ہے اور ایک ہی مقصد پر کام ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مقصد کے بعد ایک اور مقصد اور پھر اس کے اندر ایک اور مقصد، غرض مقاصد کا ایک لگاتار سلسلہ ہوتا ہے اور کہیں جا کر آخر کار ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی دماغ میں خواہ سرِ دست وہ مقصد موجود نہ ہو اور وہ اسے ظاہر بھی نہ کر سکتا ہو لیکن تحت الشعور کوئی مقصد یا مقصد در مقصد ہوتا ضرور ہے۔ مثلاً آپ کسی شخص سے پوچھئے کہ "بھئی تم کھانا کیوں کھاتے ہو؟" تو وہ جواب دیگا "بھوک دور کرنے کو"۔ اس کا سرسری جواب اسی قسم کا ہوگا لیکن وہ بھوک کیوں دور کرتا ہے؟ ایک اندرونی اذیت سے بچنے کو یا اپنی بدنی قوت برقرار رکھنے کو۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ تندرست رہنے کو۔ تندرست رہنے کا کیا مقصد ہے؟ خوش رہنا۔ خوش کیوں رہنا چاہتا ہے؟ زندگی کے کچھ کام اچھی طرح کرنے کو۔ اچھی طرح کام کرنے کی غرض کیا ہے؟ اپنی یا اپنے خاندان یا قوم کی یا زیادہ سے زیادہ تمام بنی نوع انسان کی بھلائی۔ اس بھلائی کی خواہش کیوں ہے؟ اپنا فرض پورا کرنے کیلئے۔ اپنا فرض کیوں پورا کرتا ہے؟

اچھی مثال قائم کرنے بانیک نامی پیدا کرنے یا ضمیر کی آواز کی تکمیل کرنے یا اطمینان نفس کیلئے ـــــ اس کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں آکر جواب ختم ہو جاتا ہے کسی کا جواب اس مرحلے پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں کہیں ختم ہو جائیگا اور کوئی اس مرحلے سے چند قدم آگے چل کر کہیں نہ کہیں سلسلۂ سوالات کا آخری جواب اپنی انتہا کو پہنچ کر ختم ہو جائے گا۔ ایک بڑے سے بڑا انسان بھی ـــــ اگر وہ اس دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا ہو اور اس دنیا ہی کو دنیا کا مآل جانتا ہو ـــــ اپنا آخری مقصد وہی کچھ بتائے گا جو اسی دنیا میں ختم ہو جاتا ہو۔ لیکن کسی "مذہب" یا "دین" سے تعلق رکھنے والا اس سے کچھ آگے بھی مقصد بتائے گا۔ اس سے صرف کھانا کھانے ہی کا نہیں (جس کا اوپر ذکر ہوا) بلکہ اس پوری زندگی کی تگ و دو کا مقصدِ آخریں دریافت کیجئے تو وہ اس حیاتِ دنیا کے بعد آنے والی زندگی کی بھلائی کو اپنی تمام سعی و عمل کی گردشوں کا آخری محور بتائے گا۔ مثلاً وہ یوں کہے گا کہ ہماری زندگی کے تمام کاموں کا مقصد (عذاب آخرت سے) نجات یا انعام الٰہی (جنت) کا حصول ہے، یا اس سے آگے وہ رضائے الٰہی کو اپنا مقصد آخریں بتائے گا۔

اس مثال سے اتنی بات تو واضح ہو گئی ہو گی کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی مقصد یا مقصد در مقصد ضرور ہوتا ہے اور وہ کہیں نہ کہیں جا کر ختم بھی ضرور ہوتا ہے۔ پس جس شخص کا مقصد حیات کسی جگہ جا کر ختم ہو جائے وہی آخری مقصد اس کا نصب العین ہوتا ہے۔ جس شخص کی دماغی پرواز جتنی زیادہ بلند ہو گی اسی قدر اس کا نصب العین بھی بلند ہو گا۔

مسلمان کے نصب العین کی شرطیں اب سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان کا نصب العین کیا ہے؟ سو واضح رہے کہ وہ محض آخری مقصد ہی نہیں بلکہ اس کے کچھ اور اوصاف بھی ہیں:۔

(۱) اس کے بعد یا اس سے آگے کسی اور مقصد کا امکان ہی نہ ہو۔ عقل، وجدان، ایمان ہر شے وہاں جا کر ختم ہو جائے اور کوئی بلند تر مقصد تجویز ہی نہ کر سکے۔

(۲) وہ نصب العین زندگی کے کسی ایک درجہ کا نصب العین نہ ہو بلکہ پوری زندگی کی ہر حرکت و سکون کا آخری محور ہو۔

(۳) زندگی کا کوئی حرکت و سکون اس نصب العین تک پہنچنے میں کھینچ تان کر یا مقصد در مقصد ہو کر لمبا راستہ نہ طے کرے، بلکہ حتی الامکان براہ راست اس نصب العین تک پہنچے۔

(۴) وحی الٰہی نے اس مقصد کو تجویز کیا ہو نہ کہ ہماری عقلی پروازوں نے۔

(۵) وحی نے اسے مبہم الفاظ میں نہ بیان کیا ہو بلکہ صاف، واضح، جلی اور غیر مبہم الفاظ میں اسے نصب العین قرار دیا ہو۔

(۶) اس کے علاوہ کوئی نصب العین خواہ وہ کتنا ہی بلند ہو نقص سے خالی نہ ہو۔

(۷) وہ نصب العین محض زندگی کی تگ و دو اور سرگرمیٔ عمل ہی کا مرکز نہ ہو بلکہ وہی تنہا محبت، خوف، امید، توکل، طلب، عقیدت، اخلاص، اطاعت، پرستش وغیرہ سب کا آخری مرکز ہو۔

(۸) اس نصب العین میں ضعف، خامی، نقص، زوال اور فنا وغیرہ کا امکان نہ ہو۔

(۹) وہ کامل اور ناقابلِ انقسام وحدت ہو۔

(۱۰) ناقابلِ تغیر و تبدیل حقیقت ہو۔

ان دس نمبروں میں جو کچھ تصریحات ہیں ان کا مرکزی مضمون نمبر ۲ و ۸ ہے، باقی سب ان ہی کی شرحیں ہیں جن کو آپ سمیٹ کر کم سے کم نمبروں میں بھی لاسکتے ہیں لیکن جو حقائق ان میں بیان ہوئے ہیں ان میں کسی ایک کی تخفیف بھی نصب العین کو نصب العین نہیں رہنے دیگی۔ بہرکیف ان تمام اوصاف و شرائط کو سامنے رکھکر دیکھ جائیے کہ ایک مسلمان کا نصب العین کیا ہوسکتا ہے یا کیا ہونا چاہئے؟ لیکن اس کی نشاندہی سے پہلے بہتر ہوگا کہ ان تمام نصب العینوں کا تجزیہ بھی کرلیا جائے جو اس وقت تک ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ہم ان سب کو چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

مختلف نصب العینوں کا تجزیہ

(۱) پہلا نصب العین ہے . . . حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا، اقامت دین، خلافت الٰہیہ کا قیام، صالح نظام زندگی برپا کرنا، قرآنی قانون کا نفاذ، استخلاف فی الارض وغیرہ۔ الفاظ بدلے ہوئے ہیں مگر مفہوم سبھوں کا قریباً ایک ہی ہے۔ یہ مقاصد بڑے اعلیٰ ہیں اس میں شک نہیں لیکن ہر اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد کا نصب العین ہونا لازم نہیں۔ دیکھ جائیے کیا تمام شرائط اس میں پائی جاتی ہیں۔ چوتھی پانچویں شرط نہیں پائی جاتی۔ قرآن پاک میں کہیں بطور نصب العین ان باتوں کا ذکر نہیں اور نہ ان کو بحیثیت نصب العین اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اگرچہ انبیائے کرامؑ سے ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (دین قائم کرو اور اس میں تفرق نہ پیدا ہونے دو) کہا گیا ہے تو یہ اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) کی طرح ایک حکم ہے منجملہ اور احکام کے۔ اسے نصب العین نہیں کہا جاسکتا۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ولا تتفرقوا فیہ (دین میں تفریق نہ کرو) بھی ہمارا نصب العین ہے اور ہماری تمام مساعی حیات لا تتفرقوا فیہ کے لئے ہے؟ کوئی حکم ربانی اور چیز ہے اور نصب العین اور شے ہے۔ یہ بنیادی حکم ایک سعی ہے جو اصل نصب العین کے حصول کا ایک لازمی طریقہ و ذریعہ یا اس طریقۂ حصول کا ایک ضروری تقاضا تو ہوسکتا ہے لیکن خود نصب العین نہیں۔ صاف لفظوں میں حکم وحی ہونا چاہئے کہ یہ تمہارا نصب العین ہے۔ علاوہ ازیں ساتویں آٹھویں شرطیں بھی اس میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کے متعلق ہم کچھ آگے بھی عرض کرینگے۔

(۲) دوسرے لفظوں میں نصب العین یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "تمام انسان اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئیں اور اس طرح جوہرِ انسانیت کی مکمل نشوونما سے اس زندگی میں سرفرازی و سربلندی حاصل کریں، اور آئندہ ارتقائی منازل کو بحسن و خوبی طے کرنے کے قابل ہوجائیں"۔ ان مقاصد کے اعلیٰ ہونے میں بھی کلام نہیں۔ ان کو تین ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ان میں نہ تو ناقابلِ انقسام وحدت ہے نہ ان کے لئے وحی کے صاف و صریح الفاظ ہیں۔ غرض چوتھی، پانچویں، ساتویں، آٹھویں، نویں، دسویں کوئی شرط پوری نہیں پائی جاتی۔ یہ تمام باتیں اصل نصب العین کے خوشگوار نتائج و ثمرات اور اعلیٰ انعامات و صلات تو ہوسکتے ہیں لیکن خود نصب العین نہیں۔

(۳) تیسرا نصب العین ہے نجات اخروی، حصول جنت، دوزخ سے بچنا وغیرہ۔ یہ بھی اصل نصب العین کا نتیجہ اور انعام ہے،

خود نصب العین نہیں۔ قرآن میں اسے نصب العین بتا کر نہیں پیش کیا گیا ہے اور نہ یہ ناقابلِ انقسام وحدت ہی ہے۔ اس میں بھی پہلی، چوتھی، پانچویں، چھٹی، ساتویں، نویں، دسویں شرطیں نہیں پائی جاتیں۔

(۴) چوتھا نصب العین ہے رضائے الٰہی، قربِ الٰہی، معرفتِ الٰہی، فنائیت فی اللہ وغیرہ۔ تمام مقاصد میں اعلیٰ ترین مقاصد یہی ہو سکتے ہیں لیکن ان کا نصب العین ہونا بھی محلِ نظر ہے۔ قرآن پاک میں ان کے نصب العین ہونے کی صراحت نہیں۔ ابتغائے مرضات اللہ، یا ابتغائے فضلِ الٰہی کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے وہ اہلِ ایمان کی بہت سی صفات میں سے ایک صفت بیان کی گئی، ان کا نصب العین نہیں بیان کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص فضلِ الٰہی کا طلبگار ہو تو بھی ٹھیک ہے، رضا چاہتا ہو جب بھی درست ہے، قرب کا خواہشمند ہو پھر بھی غلط نہیں، معرفت کا طالب ہو اس وقت بھی قابلِ ملامت نہیں، فنائیت کی طلب میں فنا ہو جب بھی صحیح ہے۔ جب سب ہی ٹھیک ہیں تو آخر نصب العین کیا ہوا؟ ایک ہی شخص یہ ساری باتیں بطور نصب العین کے بیک وقت اختیار کر سکتا ہے لیکن اس صورت میں یہ ناقابلِ انقسام وحدت نہیں رہے گی، اور اگر مختلف اوقات میں ان کو اختیار کرے تو غیر متبدل حقیقت نہیں باقی رہتی۔ غرض اس نصب العین میں نویں اور دسویں کے علاوہ پہلی، چوتھی اور پانچویں شرطیں بھی نہیں پائی جاتیں۔ گلاب کے پھول کی شکل، رنگت، خوشبو، خاصیت یہ چاروں اجزا ایک دوسرے سے ناقابلِ انفکاک طور پر باہم پیوستہ ہیں لیکن سب الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ اگر ایک جزو کو مقصد قرار دیا جائے تو باقی تین سے (جو ایک ہی پھول کے جداگانہ اجزا ہیں) صرفِ نظر ہو جائے گا اور تمام اجزا کو مجموعی طور پر مقصد بنا لیا جائے تو یہ مجموعیت ناقابلِ انقسام وحدت نہیں رہے گی۔ اس کی مزید تشریح کچھ آگے چل کر بھی آئے گی۔

مسلمان کا نصب العین اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ سب کچھ بھی نصب العین نہیں تو آخر مسلمان کا نصب العین ہے کیا؟ نصب العین بھی ایسا ہو جو ہر نقص سے خالی ہو اور تمام شرائط کا جامع ہو۔ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے اور ایک ہی لفظ ہے . . .

"اللہ"

اس نصب العین کی دلیل اس نصب العین کے صحیح ہونے کے لئے ہمیں سب سے پہلے چوتھی اور پانچویں شرط کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھنا چاہئے۔ اگر وحی الٰہی نے اس نصب العین کو متعین کیا ہو تو باقی شرائط خود بخود اس میں لازماً پائی جائیں گی اور سونی صد سب پوری اتریں گی۔ وحی میں اسے تلاش کرنے کے لئے کسی خاص کاوش و کاہش کی ضرورت نہیں۔ وہ تمام آیات جن میں لا الٰہ "لا اللہ یا لا الٰہ الا اللہ" من اللہ غیرہ کو دہرایا گیا ہے وہ سب اسی حقیقت کا ایک واضح اور غیر مبہم بیان ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی نصب العین نہیں"۔

اللہ کے معانی کا تجزیہ لفظ "اللہ" کے جو ترجمے اس وقت تک ہمارے سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) **معبود**۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جس کی عبدیت و غلامی اختیار کی جائے، پرستش سے، اطاعت سے اور دوسرے لفظوں سے بھی، گویا وہ مسجود بھی ہے اور مطاع بھی۔ لیکن اللہ کا پورا مفہوم اس سے ادا نہیں ہوتا اس لئے کہ معبودیت اس "مقصودِ مطلق" کی بہت سی

صفات میں سے ایک صفت ہے جس کی ذیل میں چند اور صفات بھی داخل کی جا سکتی ہیں۔ (شاید اس کی مزید توضیح آگے بھی آئے گی۔)

(۲) خدا۔ یہ بھی کوئی جامع ترجمہ نہیں، محض ایک ناقص لفظی ترجمہ ہے وہ بھی اس لئے کہ فارسی میں کوئی اور لفظ نہ مل سکا۔ بعض لوگ اسے "خود آ" (یعنی از خود وجود میں آنے والا) کا مخفف بتاتے ہیں۔ اگر ایسا ہے جب بھی یہ صرف ایک ہی جزئی صفت کا مظہر ہے۔

(۳) حاکم۔ یہ بھی محدود مفہوم کا حامل ہے۔ اگر لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ لا حاکم الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی حاکم و مطاع نہیں) کیا جائے تو بھی اس کی بہت سی صفات مستقلّہ میں صرف ایک صفت کا اقرار ہوگا یا اس میں دوسری صفات کو کھینچ تان کر داخل کرنے کا تکلف کرنا پڑے گا۔ اس میں اللہ کی محبت، عقیدت، توکل، طلب، امید وغیرہ کی براہ راست دعوت کی جھلک نہیں۔ ان کے لئے دوسرے احکام تلاش کرنے پڑیں گے۔ یہ ترجمہ اس صورت میں سو فی صد صحیح ہو سکتا تھا جب ہمارا نصب العین "حکومتِ الٰہیہ" کا قیام قرار پاتا لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، یہ نصب العین نقص سے خالی نہیں۔ لفظ الٰہ میں حاکمیت کا مفہوم موجود ہونے سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ فی الواقع اس کا ترجمہ حاکم یا مطاع ہی ہے۔ دیکھئے جس طرح لا حاکم الا اللہ کا اقرار صحیح اور ضروری ہے اسی طرح لا رحمٰن الا اللہ، لا مالک الا اللہ، لا غفار الا اللہ، لا قدوس الا اللہ غرض سارے اسمائے حسنیٰ کی نفی و اثبات بھی صحیح اور ضروری ہے۔ پھر لا حاکم الا اللہ کی کیا خصوصیت ہوئی جو وہ کلمۂ شہادت کی بنیاد بن گیا اور باقی اسمائے صفات نہ بن سکے؟ اگر "حاکمیت" کے اقرار میں سب بقیہ باتیں آجاتی ہیں تو لا مالک الا اللہ اور لا رب الا اللہ اور لا خالق الا اللہ وغیرہ میں بھی ہر کلمے کے متعلق بڑی آسانی سے یہی دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کا صحیح مفہوم | غرض معبود، خدا اور حاکم وغیرہ کوئی بھی لفظ الٰہ کا جامع مفہوم نہیں ادا کرتا کیونکہ ہر ایک ترجمہ صرف "صفات" کو واضح کرتا ہے وہ چند ایک مخصوص صفات کو۔ "ذات" کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کرتا (ابھی ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کیا تعلق و نسبت ہے) ہم جہاں تک غور کر سکے ہیں وہ یہ ہے کہ لفظ الٰہ کے مفہوم اور روح کو جو جامع لفظ زیادہ سے زیادہ ادا کر سکتا ہے وہ **نصب العین** کا لفظ ہے۔ نصب العین سے کیا مراد ہے اسے آپ شروع ہی میں پڑھ چکے ہیں اور مسلمان کا نصب العین اپنے اندر کیا شرائط رکھتا ہے اسے بھی دیکھ چکے ہیں۔ اب لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ یوں ہوگا "اللہ کے سوا کوئی نصب العین نہیں" "مالکم من الٰہ غیرہ" کا ترجمہ اس طرح ہوگا "اس کے سوا اور سے تمہارا کوئی نصب العین نہیں"۔ اب ذرا اللہ کو نصب العین ماننے کے بعد تمام شرائط مذکورہ کو ایک نظر پھر دیکھ جایئے اور بتایئے کیا کوئی شرط ایسی ہے جو یہاں پوری ہونے سے رہ جائے۔

اللہ کو نصب العین ماننے کے بعد | الغرض نصب العین صرف اللہ ہے اور کچھ نہیں اور یہی اقرارِ الوہیت (الٰہیت) یعنی "لا الٰہ الا اللہ" اور "مالکم من الٰہ غیرہ" کا مطلب ہے لیکن اللہ کو نصب العین تسلیم کر لینے کے بعد لازماً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نصب العین کے حصول یا اس تک رسائی کس طرح ہو؟ وحیِ الٰہی کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے نصب العین کی اس واضح تعیین کے ساتھ طریقۂ حصول و

رسائی بھی بیان کر دیا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے ایک ہی متفق علیہ پیغام سنوا دیا ہے کہ یٰقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ اللہ کی عبدیت و غلامی اختیار کرو، اللہ کے سوا تمہارا کوئی نصب العین نہیں۔ یہاں ایک ہی جملے میں نصب العین اور اس کا طریقۂ حصول رسائی دونوں ہی بیان کر دیئے گئے ہیں۔

یہ عبدیت اختیار کرنے کے بعد ہی اس کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں جن میں کفر بالطاغوت، اجتنابِ طاغوت، تزکیہ، اوامر و نواہی کا لحاظ، غرض سارے احکام الٰہی (اپنے اپنے مواقع پر) داخل ہیں۔

یہ تقاضہائے عبدیت امتحانات کی بھٹیاں ہیں جن سے گزرنے کے بعد کچھ خوشگوار نتائج حاصل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان ہی انعاموں اور صلوں کا وعدہ فرماتا ہے۔ استخلاف فی الارض اور اس کے ثمرات، نجات، جنت، رضا یا قرب وغیرہ۔

چار اجزاء آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ نصب العین، اس کا طریقۂ حصول، اس طریقے کے تقاضے اور ان کے انعامات و ثمرات، سب کے سب الگ الگ اجزا ہیں اگرچہ ایک دوسرے کے ساتھ ناقابل انفکاک طور پر وابستہ و پیوستہ ہیں۔ ایک کو دوسرے میں خلط ملط کرنا صحیح نہیں۔ شکل، رنگت، خوشبو اور خاصیت، سب ایک ہی پھول سے وابستہ ہیں لیکن شکل کو خاصیت، خاصیت کو خوشبو، خوشبو کو رنگ اور رنگ کو شکل قرار دینا صحیح نہیں۔ جڑ، تنہ، شاخیں، پتے، پھول اور پھل سب ایک ہی درخت سے وابستہ ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک چیز بھی درخت نہیں کہی جائے گی۔ یہ چار موٹے موٹے اجزا ہم نے سرسری طور پر تجویز کئے ہیں جن میں آپ کمی بیشی بھی کر سکتے ہیں۔ ہماری غرض تو صرف یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کا صحیح مقام دیا جائے اور کسی مقام کے تعین میں خلط ملط نہ ہو۔

نتیجہ حکومت الٰہیہ یا خلافت ارض نصب العین نہیں بلکہ نصب العین کے طریقۂ حصول (عبدیت) کے ہزارہا انعامات میں سے ایک انعام اور ایک صلہ ہے اور اسی صلے کا اللہ کی طرف سے یوں وعدہ ہے کہ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض۔ مخ نجات یا قرب و رضا وغیرہ بھی انعام یا نتیجہ و ثمرہ ہے اصل نصب العین کی عبدیت کا۔ انسان کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سرفرازی حاصل کرنا اور منازل ارتقا طے کرنا بھی ایک خوشگوار نتیجہ ہے نہ کہ نصب العین۔ ان تمام خوشگوار نتائج و ثمرات سے پہلے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دینا تقاضا ہے عبدیت کا نہ کہ خود نصب العین ہے۔ عبدیت کا اختیار کرنا بھی ایک واحد ذریعہ و طریقہ ہے حصول نصب العین کا، بذاتِ خود نصب العین نہیں۔

ایک آیت پر غور اس آیت پر ذرا غور و تدبر فرمائیے قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین۔ اس آیت میں زندگی کی تمام بنیادی اور اہم حرکت و سکون کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے لیکن کس مقصد (نصب العین) کیلئے؟ للہ۔ اللہ کے لئے۔ ان تمام گردشوں کا محور ایک ہی ہے اللہ۔ آیت میں للہ ہے۔ لاقامۃ الدین نہیں، لقیام الحکومۃ الالٰہیہ بھی نہیں۔ للاستخلاف فی الارض، لتنفیذ قوانین القرآن، لطی منازل الارتقاء الانسانیہ، حتی کہ للنجوٰۃ اور لرضاء اللہ بھی نہیں۔ صرف للہ۔

اگر اللہ کی راہ میں یعنی فی سبیل اللہ کچھ ہوگا تو وہ عبدیت یا اس کا تقاضا ہوگا "اللہ" نہ ہوگا کیونکہ نصب العین اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ طریقۂ حصولِ نصب العین یعنی عبدیت ہے یا تقاضائے عبدیت یا ثمرۂ عبدیت (یعنی صلہ وانعام عبدیت) ہمارا مقصود (نصب العین) صلہ نہیں، صاحب صلہ یا واہب صلہ ہے، انعام ہمارا نصب العین نہیں بلکہ خود منعم ہے۔ حکومتِ اسلامیہ یا ریاست الٰہیہ نہیں بلکہ وہ ذات ہے جس تک رسائی کے ذریعوں میں سے ایک ذریعہ یا جس کے انعامات میں سے ایک انعام یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت (نہ کہ اِس وقت) نظامِ حکومت اسلامیہ قائم کرنے کی بجائے دنیا سے کٹ کر اپنے ایمان کو سلامت رکھنے کے لئے اصحابِ کہف کی طرح گوشۂ انزوا اختیار کرنا ہی عین تقاضائے عبدیت ہو۔

ایک لمحۂ فکریہ | کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی ـــ کی زندگی ـــ میں کبھی اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کی دعوت دی ہے اور ایمان لانے والے اسی کو نصب العین سمجھ کر ایمان لائے ہیں؟ کیا اس کا کوئی اشارہ کتاب اللہ سے ـــ ورنہ سنت رسول اللہ سے ہی ـــ ملتا ہے؟ پھر کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم ایک ایسی حقیقت کو اپنا نصب العین قرار دیں جس کی طرف مکے کی تیرہ سالہ زندگی میں حضورؐ نے اشارہ تک نہ کیا ہو؟ اس قسم کی دعوت میں تو خدا کے نام پر خود اقتدارِ حکومت حاصل کرنے کی بُو بھی آسکتی ہے اور اللہ کو نصب العین قرار دینے والا تو اتنی رمق بھی اپنے اندر باقی رکھنا پسند نہیں کر سکتا۔ نظامِ حکومتِ اسلامیہ وغیرہ تو ایک انعامِ الٰہی ہے جو خود بخود آتا ہے، یہ نصب العین بنائے جانے کی چیز ہی نہیں۔

دوسرے اعلیٰ مقاصد | اسی طرح رضائے الٰہی بھی نصب العین نہیں۔ نصب العین تو صرف وہ ذاتِ صمدانی ہے جس کی بارگاہِ صمدیت سے رضا کے پروانے تقسیم ہوتے ہیں ـــ رضا، قرب، معرفت، فنائیت، معیت وغیرہ یہ سب دراصل وہ باہم متقارب راستے ہیں جو اصل نصب العین تک چلے جاتے ہیں اور کیا عجب والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا والی آیت میں سبلنا (راستوں) سے مراد یہی راستے ہوں۔ فٹ بال کا میچ آپ نے دیکھا ہوگا۔ ہر ٹیم کا مقصد (اس وقت کا نصب العین) یہ ہوتا ہے کہ دوسری ٹیم کو جتنے گول سے ممکن ہو شکست دی جائے۔ گول سے ہرانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فٹ بال کو جائز طریقے سے ایک معین طول وعرض کے درمیان سے گزار دیا جائے۔ عموماً اس کیلئے کک (Kick) لگانی پڑتی ہے۔ یہ ٹھوکر (Kick) خواہ سنٹر سے ہو ..... یا ونگ سے یا کارنر سے، کیری (Carry) کرکے ہو یا پُشنگ (Pushing) کرکے یا پاسنگ (Passing) کرکے ہو، جس طرح بھی ہو فٹ بال کو معین چوکھٹے کے اندر سے (حدود مقابلہ سے متجاوز ہوئے بغیر) گزار دیا جائے۔ یہ سب طریقے اور راستے ہیں گول کرنے کے، لیکن خود گول نہیں گول (Goal) یا مقصد ہے فٹ بال کو مخصوص حلقے کے اندر سے گزار دینا۔ پس اللہ کی رضا چاہی جائے یا قرب، یا معیت، یا معرفت یا فنائیت یا کچھ اور یہ سب مختلف "اذواق" کی سبل (راستے) ہیں۔ مقصود نصب العین صرف وہ ذات ہے جس کا قرب یا جس کی معیت، یا جس کی رضا یا جس کا عرفان یا جس میں فنائیت مطلوب ہو۔ (فاسلکی سبل ربك ذللا کو بھی اگر سامنے رکھ لیا جائے تو شاید لنھدینھم

سبیلنا کا مفہوم کچھ اور زیادہ واضح ہو سکے۔)

ایک اہم سوال کا جواب یہ سوال اکثر ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ نصب العین، ذریعۂ حصول، اس کے تقاضے اور اس کے نتیجے میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں، غرض تو سب کی ایک ہی ہے کہ نیک عمل ہوں، دنیا میں امن رہے، انجام اچھا ہو وغیرہ وغیرہ لہذا ان علمی موشگافیوں کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن کیا کیا جائے کہ اس دور میں عمل کم اور علمی موشگافیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ بایں ہمہ نصب العین کی تعیین میں بال برابر بھی بل آجائے تو آگے چل کر میلوں اور فرسخوں کا فرق پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلئے ہر سمجھدار مسلمان اپنا صحیح نصب العین اگر متعین کر لے تو کوئی بری بات نہیں ہوگی اچھی ہی بات ہوگی۔ اگر کوئی شخص گلاب کی شکل یا رنگت کو مقصد بنالے تو اسے گلاب کی خوشبو یا خاصیت سے کوئی بحث نہ ہوگی۔ وہ کاغذ کے پھول سے بھی وہی کام لے لے گا جو قدرتی گلاب سے لیا جاتا ہے کیونکہ اس کا مقصد کاغذی گلاب سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا مقصد محض بوئے گل ہو تو اسے اس کے مجموعی شکل و رنگ وغیرہ سے کوئی غرض نہ ہوگی۔ برگہائے گل کو بکھیر کر، مَل کر اور تلوں میں بسانے کیلئے اس کی رنگت و شکل کو بگاڑ کر بھی اپنا مقصد پورا کرے گا۔ یونہی جس کا مقصد صرف خاصیت ہو وہ اس کا رنگ، شکل، خوشبو سب کو ختم کرکے گلقند تیار کرے گا۔ لیکن جس کا مقصد یہ اجزاء نہ ہوں بلکہ خود پھول ہو اس کے پاس پھول اپنے تمام اجزاء سمیت ہوگا[1] ــــ یہ ہے وہ فرق جو نصب العین کی تعیین کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ مثالیں عالم محسوسات میں بھی چار و ناچار پاؤں پر نہیں چلا کرتیں چہ جائیکہ دنیائے وراء المدرکات میں۔ وہاں تو لیس کمثلہ شیٔ کی ایسی قدغن کھڑی ہے جسے طائرِ قیاس و خیال بھی عبور نہیں کر سکتا۔ تاہم سمجھانے کے لئے کوئی محسوسات ہی کی مثال دی جاتی ہے۔ مثالوں میں یا خود نفس اظہار ما فی الضمیر میں کوئی سقم نظر آئے تو اسے خود ٹھیک کر لیجئے ــــ آج اللہ ــــ فقط اللہ ــــ کے سوا جن منصب العینوں کے عام چرچے ہیں ان میں بہت کچھ ہمنوائی و ہمرنگی پائی جاتی ہے۔ جس لیڈر، جس مولوی، جس مفکر، جس شاعر، جس اڈیٹر، جس عامی سے دریافت کیجئے وہ اسلام، اسلام، قرآن، قرآن، حکومت الہیہ، حکومت اسلامیہ، دین، دین، خلافتِ ربانی، قانون آسمانی کے الفاظ کو صف اول میں جگہ دے گا۔ مگر اس کے باوجود سب باہم دست و گریباں ہیں۔ اس کی وجوہ و اسباب ایک نہیں۔ میرا موقف یہ مقالہ لکھتے وقت ان تمام اسباب کا تجزیہ کرنا نہیں۔ اس مقالے سے جس خاص وجہ و سبب کا تعلق ہے وہ اسی قدر ہے کہ وحدتِ امت کے لئے وحدتِ خیال ضروری ہے اور وحدتِ خیال صرف وحدتِ نصب العین سے ہو سکتی ہے اور نصب العین وہی ہو سکتا ہے جو خود ناقابلِ انقسام وحدت اور غیر متغیر حقیقت ہو۔ ذرائع و وسائل، تقاضے اور نتائج سب ہی اپنی شکلیں بدل سکتے ہیں اور اس تبدل و تغیر کے باوجود وسائل و وسائل ہی رہیں گے، تقاضے تقاضے ہی کہے جائیں گے اور نتائج نتائج ہی ہوں گے۔ اگر ان میں سے کسی شے کو نصب العین بنا لیا گیا تو ہر تغیر ایک نیا نصب العین بن کر کچھ نئے پرستاروں کا گروہ الگ پیدا کرلے گا اور کان الناس امۃ واحدۃ کا نازک آبگینہ گروہوں کے اپنے ہی تصادم سے ریزہ ریزہ

---

[1] کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے ؎ ہر کسے بہوائے خود دارد ز تو مقصودے ٭ اے جملہ طفیلِ تو من از تو ترا خواہم

ہوجائے گا جس طرح آجتک ہوتا رہا ہے لیکن نصب العین اور صحیح نصب العین ــــ اللہ ــــ اپنے اندر کوئی انقسام اور کوئی تغیر نہیں رکھتا، اس لئے اس نصب العین کے پرستاروں میں تفرق و انقسام کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نصب العین سے بال برابر بھی نیچے اُتر آیئے تو اصل مرکز سے اتنی دوری ہوجائے گی جو آگے چل کر اللہ ہی جانے کہاں سے کہاں لے جا کر ڈال دے گی۔ اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو اللہ سے آگے کوئی اور نصب العین تلاش کیا جائے جو عقلاً و حیاً و جداناً ایماناً ہر طرح ناممکن ہے، یا پھر اسی کو نصب العین قرار دے کر اس سے نیچے کے تمام جزئی "نصب العینوں" کو ختم کر دیا جائے۔ جب ہم اسلام لانے والوں سے ادخلوا فی السلم کافۃ کہہ کر پورے اسلام کا مطالبہ کرتے ہیں تو نصب العین کی کسی ایک دو صفت کو نصب العین قرار دیدینا کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

غلط فہمی کا سبب یہ مغالطے غالباً اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ لفظ الٰہ کا مفہوم کُلّی نہیں لیا گیا ہے بلکہ اپنی اپنی پسند یا پرواز کے مطابق کوئی ایک جزئی مفہوم لے کر کل کو اس میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ گویا مابعد نصب العین میں ہم جس غلطی سے لوگوں کو بچانا چاہتے ہیں اسی غلطی کا ارتکاب بنیادی حقیقت یعنی خود نصب العین کے معاملے میں خود ہم سے ہو رہی ہے۔ اگر ہم کسی ملازم سے کہیں کہ "ہمیں بوتل چاہئے" تو دور کے سننے والوں میں میخوار شراب کی بوتل سمجھے گا، مریض دوا کی بوتل خیال کرے گا، پیاسا سوڈے، لیمونیڈ یا شربت کی بوتل تصور کرے گا، سردی کا مارا گرم پانی کی بوتل یقین کرے گا، حالانکہ ہمارا مقصود محض خالی بوتل ہے جس کے اندر کچھ نہ ہو۔ سوچنے والے اس خالی بوتل کو جو جو کچھ بھی سمجھیں گے وہ درحقیقت اپنی اندرونی کیفیات اور تحت الشعور سے ابھرنے والے جذبات ہوں گے اور ان ہی تصورات کی بنیاد پر ہر ایک اپنی اپنی پوری عمارت "تاثر یا" تعمیر کرلے گا۔ بنیاد ہر ایک کی بوتل ہی بنے گی لیکن اس بنیاد پر تعمیر ہونے والی ذہنی عمارت کہیں میخانہ ہوگی اور کہیں دواخانہ، کہیں ہوٹل ہوگی اور کہیں آتش خانہ۔ کیا عجب کہ لفظ اللہ کے ساتھ بھی ایسی ہی قیاسی ستم ظریفیاں ہوئی ہوں اور اس برے کل کو کسی جزء سے پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور اس پر لیبل کلیت ہی کا چسپاں فرما دیا گیا ہو۔

سوچئے مضمون بڑھتا جا رہا ہے اور ابھی کئی گوشے تشنہ رہ گئے ہیں جن کی تکمیل انشاء اللہ آئندہ ہوگی۔ اس وقت صرف چند باتوں پر غور و فکر کیجئے۔ شاید لا الٰہ الا اللہ کا اور بہتر مطلب واضح ہو سکے۔

(۱) کیا واقعی اللہ کے سوا کوئی اور چیز نصب العین بن سکتی ہے جس پر "نصب العین" کی تمام شرطیں پوری اتریں؟

(۲) کیا الٰہ کا مفہوم نصب العین کے سوا کسی اور دوسرے ایسے لفظ سے واضح ہو سکتا ہے جو اس کی کلیت کو برقرار رکھے اور اللہ پر پوری طرح چسپاں بھی ہو جائے؟

(۳) کیا قرآن پاک میں "محض نصب العین کی حیثیت سے" اللہ کے سوا کسی دوسرے بلند سے بلند مقصد کو پیش کیا گیا ہے؟

(۴) کیا اللہ کو "نصب العین" اور الٰہ کو "بمعنی نصب العین" تسلیم کرنے میں کوئی ایسا مُقفل نظر آتا ہے جو آپ کی ذہنی پستی کا سبب ہو

یا اس کے برعکس آپ کو اور پستی کی طرف لے جاتا ہے؟

(۵) جب تک ہمیں اللہ کا مفہوم ادا کرنے کیلئے "نصب العین" سے اور زیادہ بہتر لفظ نہ ملے اس وقت تک اسے اختیار کئے رہنے میں کوئی ایسی خرابی ہے جو دوسرے ترجموں میں پیدا ہوتی ہے؟

حرفِ آخر اس مقالے کو پڑھتے وقت آپ مجھے ایک فیصلہ کن مفتی نہ تصور فرمائیں بلکہ ایک ناچیز مستفتی کی حیثیت دیکر پڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے استفسارات خود میری بہت سی اصلاحات کا ذریعہ بن سکیں گے انشاء اللہ العزیز۔ اس مقالے میں جہاں جہاں مقصد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مقصود، مقصود ہے یعنی اسم ظرف نہیں بلکہ اسم مفعول مراد ہے۔

طلوعِ اسلام اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمان کی زندگی کا نصب العین اللہ ہے۔ شروع سے آج تک یہی سنتے چلے آرہے ہیں اور یہی آج بھی کہا جا رہا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص کا نصب العین دولت کا حصول ہے اور اس کے بعد کوئی یہ کہے کہ اس نے اپنے نصب العین کو پالیا ہے تو ساری دنیا سمجھ جائے گی کہ اس نے دولت حاصل کر لی۔ لیکن جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کا نصب العین اللہ ہے اور اس کے بعد وہ یہ دعوے کرے کہ اس نے اپنے نصب العین کو پالیا ہے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اس نے کیا پالیا۔ زیادہ سے زیادہ تصوف کی اصطلاحوں میں گفتگو کی جا سکے گی، یعنی یہ ایک ذاتی کیفیت کا نام ہوگا، اور یہ ظاہر ہے کہ ذاتی کیفیت نہ کسی کو سمجھائی جا سکتی ہے، نہ بتائی جا سکتی ہے، نہ دکھائی جا سکتی ہے۔ اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے تو فقط یہ کہ

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی!

ہمالیہ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا جوگی اپنے ہاں مدعی ہوتا ہے کہ میں نے خدا کو پالیا۔ خانقاہ میں بیٹھا ہوا عیسائی راہب اپنے ہاں دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے خدا کو حاصل کر لیا۔ زاویہ نشین مسلمان صوفی اپنی تحریروں سے یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ میں نے خدا کو پالیا۔ نہ کسی کے پاس اس دعوے کو پرکھنے کی کوئی کسوٹی ہوتی ہے، نہ اسے ثابت کرنے کی کوئی دلیل۔ لہٰذا اصل سوال یہ نہیں کہ مسلمان کی زندگی کا نصب العین اللہ ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس سے عملی مفہوم کیا ہے۔ ہم محترم سید صاحب سے بھی گذارش کریں گے اور ان حضرات سے بھی جو اس موضوع میں دلچسپی لیتے ہوئے کچھ لکھیں کہ وہ تجریدی گفتگو (Abstract talk) کی بجائے کھلے کھلے اور محسوس انداز میں یہ فرمائیں کہ خدا کے نصب العین ہونے سے مفہوم کیا ہے۔

لاہور میں طلوع اسلام کی سول ایجنسی مکتبہ جدید، چوک انارکلی کے پاس ہے۔ لہٰذا مقامی خریدار اور ایجنٹ مطلوبہ پرچے مکتبہ جدید سے حاصل کریں۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام

رمزِ درود

شام و صباح، رات دن، صلِّ علیٰ محمدؐ

زیست سبک ہے یا گراں، دل ہے حزیں کہ شادماں
ہے ابھی رات کا سماں، یا ہوئی صبحِ نو عیاں
آئی بہار یا خزاں، پیر ہے تو کہ نوجواں
شرطِ زماں نہ قیدِ سن، صلِّ علیٰ محمدؐ

خواہ حج و زکوٰۃ ہو، صوم ہو یا صلوٰۃ ہو
نشو و نمائے ذات ہو، تربیتِ صفات ہو
ہو کوئی کام قوم کا، یا کوئی اپنی بات ہو
بنتی نہیں بنائے بن، صلِّ علیٰ محمدؐ

پیکرِ خاک ہی نہ بن، عظمتِ زندگی سمجھ
عشق ہے جوہرِ حیات، اس کو نہ دل لگی سمجھ
روحِ سخن میں ڈوب کر، معنیٔ حرف بھی سمجھ
حرف پہ ہو نہ مطمئن، صلِّ علیٰ محمدؐ

شانِ قیام بھی سمجھ، سرِّ سجود بھی سمجھ
اس کے حدود بھی سمجھ، اُس کے قیود بھی سمجھ
رازِ سلام بھی سمجھ، رمزِ درود بھی سمجھ
یونہی فقط عدد نہ گن، صلِّ علیٰ محمدؐ

سلطنت قباد و کے، تجھ کو رسولؐ سے ملی
فقر و شہنشہی کی مے، تجھ کو رسولؐ سے ملی
عشق سی بے مثال شے، تجھ کو رسولؐ سے ملی

دیکھ یہ شے نہ جائے چھن، صلِّ علیٰ محمدؐ

جس میں ہو دین کا پیام ایسی غزل، درود ہے
دین کی مشکلات کا جس سے ہو حل، درود ہے
جس سے ہو دین کو فروغ ہر وہ عمل درود ہے
حُسنِ عمل سے رات دن، صلِّ علیٰ محمدؐ

خدمتِ خلق ہے درود، اکلِ حلال ہے درود
حُسن سلوک ہے درود، صدقِ مقال ہے درود
پیروئ رسولؐ سے کسبِ کمال ہے درود
وقت ہے تیرا ممتحن، صلِ علیٰ محمدؐ

ملّتِ بے امام میں نصبِ امام ہے درود
اُمتِ بے نظام میں سعیِ نظام ہے درود
نوعِ بشر میں کوششِ امن وسلام ہے درود
کام ہے گو بہت کٹھن، صلِّ علیٰ محمدؐ

اپنے رسولؐ پر خدا خود بھی ہے بھیجتا درود
ہر عملِ رسولؐ میں ہے مدد خدا درود
اس کی جو ہے رضا تو پھر ہر قدر و قضا درود
حور و فرشتہ، انس و جن، صلِّ علیٰ محمدؐ

امتِ حق کا اعتبار ذاتِ رسولؐ ہی سے ہے
ملّتِ پاک برقرار ذاتِ رسولؐ ہی سے ہے
دیں کا نظام استوار ذاتِ رسول ہی سے ہے
صلِّ علیٰ محمدؐ، صلِ علیٰ محمدؐ

اسدؔ ملتانی

Time commands Business
LIMTON commands Time

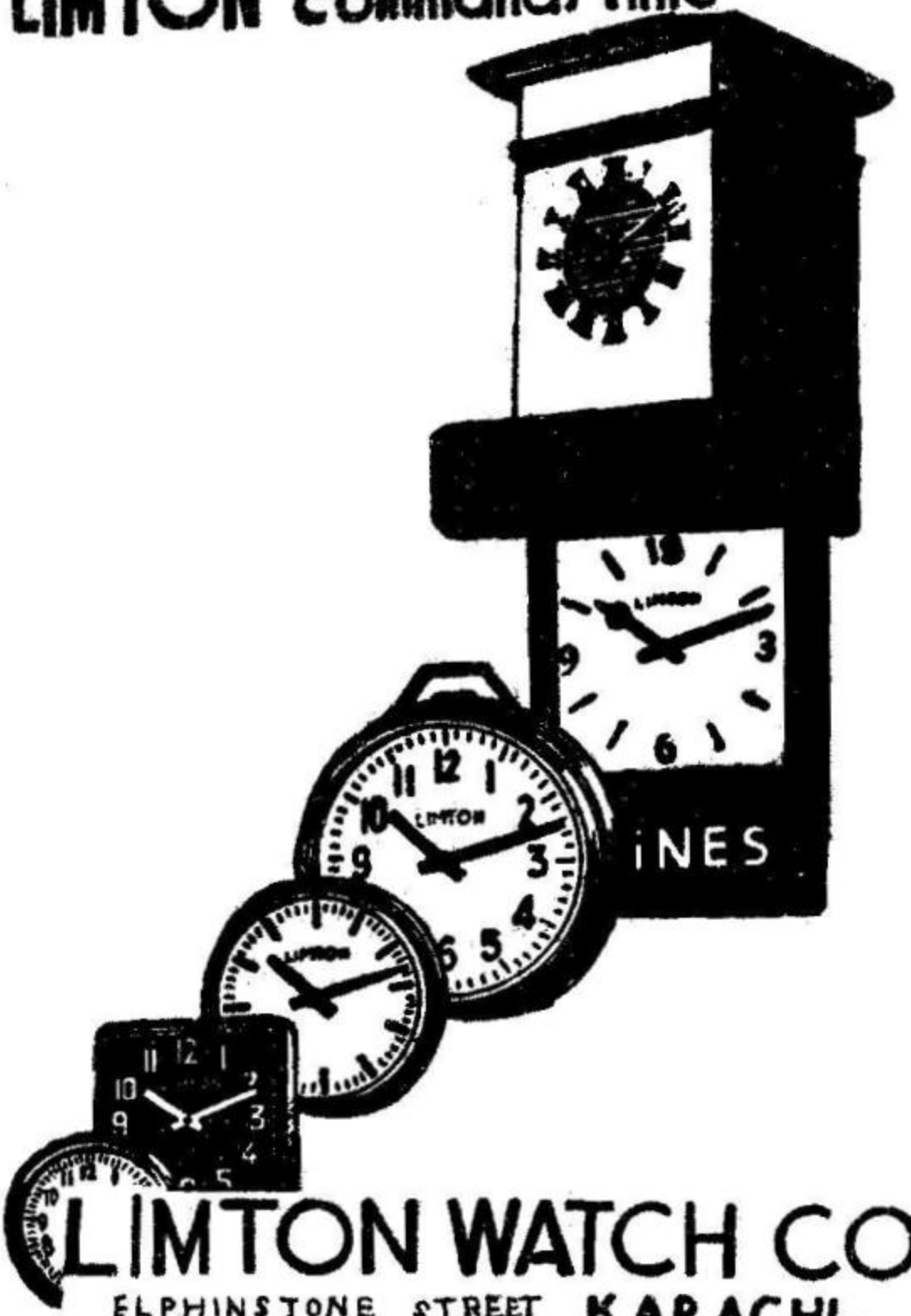

LIMTON WATCH CO
ELPHINSTONE STREET KARACHI.

(مطبوعہ ادبی پریس رابسن روڈ کراچی)